اس خاندان کے سرکاری دفاتر کراچی کے تغلق ہاؤس میں تھے۔ اسی لیے یہ تغلق خاندان کہلایا۔ ان ہی دفاتر میں بیٹھے بیٹھے وزرائے سلطنت کو پہلے پہل خیال آیا کہ دارالحکومت بدلنا چاہیئے۔ دہلی سے دیوگری چلنا چاہیئے۔ اور کچھ نہیں تو تھوڑی تفریح ہی رہے گی۔ سفر کا بھتہ ہی ملے گا۔ اس منصوبے پر عمل بعد میں ہوا۔

تغلق کا لفظ اغلاق سے نکلا ہے جس کے معنی مشکل پسندی اور مشکل گوئی وغیرہ ہیں۔ ہمارے دوست عبدالعزیز خالد اس دور میں ہوتے تو ملک الشعراء ہوتے۔ ہر وقت نعلتِ فاخرہ زیب تن کیے رہتے۔ یوں خالی بش شرٹ میں نہ گھوما کرتے۔

اس تبصرہ نگار نے شکایت کی ہے کہ مرزا غالب فلم میں شہنشاہ ظفر کے دربار کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے یکسر غلط ہے۔ اس میں غالب کے ہم عصر شعراء کے کلام پر تو بہت داد ملتی ہے لیکن مرزا غالب کو سوائے ایک دو کے کوئی داد نہیں دیتا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ہمارے خیال میں فلمساز تبصرہ نگار سے زیادہ معلومات رکھتا ہے کیوں کہ ان دنوں مرزا غالب ہمارے دوست عبدالعزیز خالد کے زمرے میں شعر کہتے تھے۔ جن کے سننے اور سمجھنے کے لیے منشی فاضل کی مدد لینی پڑتی ہے۔ چونکہ اس زمانے میں منشی فاضل کے مدرسے ابھی نہیں کھلے تھے۔ لہٰذا غالب پرستی بھی شروع نہ ہوئی تھی۔

جن عورتوں کے ہاں بچہ ہونے والا ہو۔ ان کو حکیم ڈاکٹر جہاں بھاری بھوجھ اُٹھانے اور تھکانے والی مشقت سے منع کرتے ہیں۔ وہاں عبدالعزیز خالد کے علاوہ جوش صاحب کے کلام سے بھی احتیاط رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ جن کی شاعری سے بڑوں کا پتا پانی ہوتا ہے۔ اس کی بھنک اور دھمک کسی صورت (آنے والے) کل کے لونڈوں کے کانوں تک پہنچ جائے۔ تو نتیجہ ظاہر ہے دبک کر رہ جائیں گے۔ سب ہاتھ پاؤں چلانا بھول جائیں گے۔

ایک بات البتہ معلوم ہوئی۔ کہ اپنے دوست عبدالعزیز خالد کی شاعری میں جو مقامات ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ وہ فی الواقع بیروت کی مقامی بولی میں ہیں۔

میرزا ادیب

عبدالعزیز خالد کے بارے میں بالعموم کہاجاتا ہے کہ یہ شاعر تو اصل میں عرب کے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے عربی اشعار میں اُردو الفاظ کی پیوند کاری سے بھی کام لے لیتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں اُردو کے ممتاز مزاح نگار مشتاق یوسفی نے کہا ہے:

"عبدالعزیز خالد کی شاعری ان کے اپنے لیے معلومات کا اور ہمارے لیے مشکلات کا ذریعہ بنتی ہے۔"

اس فقرے سے خالد کے شعری رویے کی خاص وضاحت ہو جاتی ہے۔

ہمارے عزیز و محترم دوست عبدالعزیز خالد جو آج کل سید ضمیر جعفری کے بقول،

"لسان الملک سے خیاط الملک بن گئے ہیں۔ اپنے انکم ٹیکس کمشنری کے زمانے میں تمام احباب کی کافی سے خاطر تواضع کیا کرتے تھے۔ افسوس صد افسوس ان کی یہ خوبصورت روایت قائم نہیں رہ سکی کیونکہ وہ خود ہی اپنے دفتر میں قائم نہیں رہ سکے۔ ہمیں کافی اور کافی کے ہمراہ جو خلوص و محبت کے تر و تازہ جھونکے آتے تھے۔ ان سے محرومی کا احساس اکثر ستاتا رہتا ہے۔ اور دل میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ اور وہ جلدی سوزن کاری سے نجات پاکر وضع داری

کی دنیا میں واپس آجائیں۔ ویسے ان کی روایت امجد اسلام امجد کے حصّے میں آگئی ہے۔ اگرچہ یہاں کافی کی بجائے کڑوا قہوہ پینا پڑتا ہے۔

عبدالعزیز خالد کا نام لیا جائے تو ذہن میں فی الفور ایسے شخص کا تصوّر جاگ اُٹھتا ہے جو ہمیشہ لغت بہ بغل، اور شعر لب نظر آتا ہے، خالد اُردو کا واقعی منفرد شاعر ہے۔ جس نے ہمارے اَدب میں مستقل اضافہ کیا ہے۔ جس نے اُردو زبان کو بے شمار ایسے الفاظ، ایسی ترکیبیں ایسے ضرب الامثال اور محاورے دیئے ہیں جن سے اس کا میدان بہت وسیع ہو گیا ہے۔

جہاں تک ذخیرۂ الفاظ کا تعلّق ہے خالد ہشت پہلو شاعر ہیں۔ عربی، فارسی، یونانی، سنسکرت، ہندی، سریانی، سرائیکی، پنجابی اور نہ جانے کس کس زبان کے الفاظ ان کی شاعری میں در آئے ہیں، ان کی قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے غیر ملکی زبانوں سے الفاظ لیتے وقت وہ اصلاً شاعر ہی رہتے ہیں۔ الفاظ کی اجنبیّت ان کے شعری ماحول پر کوئی ناخوشگوار نہیں ڈالتی۔

انھیں ایک مشکل پسند شاعر سمجھا جاتا ہے۔ مگر ایسے مشکل بھی نہیں جو اپنے بارے میں یہ کہتے ہیں

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اگر ان کی شعری نگارشات کا باقاعدہ تجزیہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ گویم مشکل، والی شق کچھ زیادہ درست نہیں اور دوسری شق سے تو انھیں کوئی واسطہ ہی نہیں۔ ویسے بھی اس کے ساتھ ساتھ ان کی مشکل پسندی کا رویّہ بدلتا چلا جاتا ہے۔

ان کے ہاں مشکل پسندی کا رویّہ تو کافی حد تک بدل گیا ہے مگر ان کا ایک اور رویّہ ایسا بھی ہے جو نہیں بدلا اور یہ رویّہ ہے تنوّع پسندی کا۔ اُردو کے بہت کم ایسے شاعر ہوں گے۔ جن کے ہاں فکر و فن کا اتنا تنوّع، اتنی بوقلمونی اور اتنی رنگا رنگی محسوس ہوتی ہے جتنی خالد کے ہاں ملتی ہے۔

خالد کے بارے میں یہ سوال زیادہ اہم نہیں کہ اُنہوں نے کیا لکھا ہے۔ زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اُنھوں نے کیا نہیں لکھا۔ وہ اُردو کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے درجنوں کے حساب سے منظوم ڈرامے لکھے ہیں۔ غیر ملکی شعری ادب کے تراجم کیے ہیں قرآنی قصص اور بائبلی اساطیر کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔ چینی شاعری کے بعد اب روسی شاعری پر کام کر رہے ہیں۔

سیّد ضمیر جعفری

سُنا ہے جب سے عربی زبان کو لازمی مضمون کی حیثیت سے رائج کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اُردو زبان میں عربی کے شاعر حضرت عبدالعزیز خالد کی کتابوں کی مانگ بڑھ گئی ہے اور ناشرین نے نئی کتابوں کے لیے ان کا گھیراؤ کر لکھا ہے۔ یہ بات نہیں کہ خالد صاحب کی کتابیں پہلے بکتی نہ تھیں۔ جیسی رفتار ہمارے ہاں کتابوں کی خاص طور پر شاعری کی کتابوں کی فروخت ہونے کی ہے ان کی کتابیں بھی ویسی رفتار سے فروخت ہو رہی تھیں بلکہ ان کی رفتار مقابلۃً تیز ہی معلوم ہوتی تھی۔ رفتار تیز نہ ہوتی تو اب تک ان کی شاعری کے (تقریباً) تیس مجموعے کیونکر شائع ہو سکتے تھے۔ ہم نے ان کی ذاتی لائبریری بھی دیکھی۔ دس بارہ ہزار کتابیں تو ہوں گی۔ مگر ان کی اپنی کتابیں آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں ہیں۔ بہرحال ان کے بارے میں عام خیال یہی تھا کہ اُردو شعر و ادب کا ایک عام قاری ان کی کتابوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے گھبراتا ہوگا کہ بیچارے کو نہ اتنی عربی آئے نہ اتنی تاریخ اسلام کہ وہ خالد صاحب کی شاعری کی پرتوں میں سے گزر سکے۔ ظاہر ہے کہ اس میں قصور قاری ہے نہ کہ خالد کا۔ آج کا قاری اگر مجنوں کا صرف ایک آسان نام جانتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خالد صاحب مجنوں کے پندرہ بیس ناموں کو اپنی گیرہ میں باندھ کر بیٹھے رہیں خالد بنیادی طور پر تو اُردو ہی کے شاعر ہیں۔ البتہ ذرا اگاڑھی اُردو" لکھتے ہیں۔ اُردو کا "شیر" میں بھگو کر عربی میں پکاتے ہیں۔ اس عمل میں بعض اوقات اُردو کے شعر میں بس اتنی ہی رہ جاتی ہے۔ جتنی اُردو پر سفیدی۔ گزشتہ برس ہمارا مشرق وسطیٰ کے بعض عرب ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا، تو دکانوں پر بعض اشیاء کے نام پڑھ کر شبہ ہوا۔ جیسے عبدالعزیز خالد کی کسی کتاب کا نام لکھا ہو۔ بلاد عربیہ میں زبان کی دقت محسوس کرتے ہوئے ہم نے بارہا سوچا کہ اگر ہم خالد صاحب کی کسی کتاب کا تازہ تازہ دودھ کر کے آتے یا کوئی کتاب ہاتھ ہی میں رکھ لیتے تو کتنی سہولت رہتی۔

کہتے ہیں، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اسی طرح علم کا پھل بھی میٹھا ہوتا ہے۔ عبدالعزیز خالد ایک مدت تک اپنی عربی اور اپنے علم کے باعث یار لوگوں کی باتیں سنتے رہے۔

عربی زبان عام ہونے سے دیکھئے گا کہ نصاب میں انھیں کا کلام پڑھا جائے گا۔ ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ جب عربی زبان کو لازمی مضمون بنانے کا فیصلہ کیا جا رہا تھا تو ارباب بست و کشاد کے سامنے یہ بات بھی تھی کہ اُردو میں جب عبدالعزیز خالد کی کتابیں موجود ہیں تو ہمیں کوئی نیا نصاب تشکیل کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ مدارس میں عربی زبان بے شک کم رائج تھی مگر عربی نصاب میں ہم خود کفیل تھے۔

جناب عبدالعزیز خالد آج کل دن میں دو غزلیں اور ایک مشاعرہ لکھتے ہیں۔ دیکھنا یعنی صدارت کے لکھا گیا۔ پچھلے دن لاہور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ رات کے مشاعرے کے لیے پا بہ رکاب بیٹھے تھے۔ سو ہم بھی ساتھ ہو لیے۔ یہ ایک نعتیہ محفل تھی۔ جو چاہ میراں میں حضرت سید میراں حسین زنجانی کے احاطہ مزار میں واقع مسجد میں منعقد ہوئی۔ جہاں ان دنوں حضرت زنجانی کے عرس کا میلہ بھرا ہوا تھا۔ مشاعرے کا اہتمام چاہ میراں کے "ادارہ اسلامی ادب و ثقافت" نے کیا تھا جو دو جواں سال شاعروں، پروفیسر تحسین فراقی اور پروفیسر افضل آرش کے لگاؤ اور لگن سے پھول پھل رہا ہے۔ مشاعرے میں دوسرے شعراء کے علاوہ حفیظ صدیقی، سلیم کاشر اور واصف علی واصف (مصنف "شب چراغ") سے مدت کے بعد ملاقات ہوئی۔ اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جیسے ہی شاعر "مائیک" کے سامنے آتا۔ سامنے سے ایک صاحب اُٹھ کر شاعر کے گلے میں ہار ڈال دیتے۔ اس کے بعد جب شاعر دوسرے یا تیسرے شعر پر پہنچتا تو پیچھے سے ایک صاحب اُٹھ کر شاعر کے کندھوں پر ایک ریشمی دوپٹہ ڈال دیتے۔

چنانچہ مشاعرے کے اختتام پر جہاں شعراء کی صف قائم تھی وہاں معلوم ہوتا تھا جیسے دُور تک پھیلے ہوں۔

اُودے اُودے، نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن۔!

یعنی جناب عبدالعزیز خالد نے مہابھارت کو بھی ترجما دیا۔ کتاب چھپ گئی۔ ان کے سدا جولاں قدم نے ایک اور کارنامہ لکھ دیا۔ اچھے ادب کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اس کتاب میں ڈوبنے کے بعد قاری کندن ہو کر دوسری طرف نکلتا ہے۔

_____ آفرین خالد صاحب پر کہ اُنھوں نے اس میدان کو بھی سمیٹ کر سر کر لیا۔ یہ عظیم کام وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے گھر کے دروازے اپنے اُوپر بند کر کے کتابوں میں سوئے اور کتابوں میں جاگے۔ مجھے تو ادب میں ان کی پیش رفت تاریخ کے ان فاتحوں کی یاد دلاتی ہے۔ جو اپنے لشکر کی تیز نقل و حرکت سے مختلف راستوں پر آگے بڑھتے ہوئے مختلف مقامات پر دس دس ہزار رسالوں کی فرودگاہیں قائم کرنے چلے جاتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ موجودہ دور کی اُردو شاعری کو عربی اور ہندی کا دودھ ایک ہی ہیڈ ورکس یعنی انکم ٹیکس سے مل رہا ہے۔ عبدالعزیز خالد محرابوں، برجیوں والے قلعے تعمیر کر رہے ہیں ——— ہر فن کار اپنے فن کا ذائقہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔

ع انسان عجیب ہے خدایا

عبدالعزیز خالد کا پھر ذکر آ گیا۔ کیوں نہ آئے دوست جو ٹھہرے۔ ہم سہ پہر کو بستر میں لیٹے برسات منا رہے تھے کہ کرنل محمد خاں نے ٹیلیفون پر کہا۔ "آجاؤ۔ لاہور سے خالد آئے ہوئے ہیں" پہنچے۔ محفل جم رہی تھی۔ لطیفے، قہقہے۔ خالد برابر کے شریک۔ ایک لطیفہ بھی ہم سے بھی سرزد ہو گیا۔ کسی بات پر خالد نے کہا کہ اُنہوں نے ساتویں جماعت میں علم عروض پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ اس پر ہم بولے۔

تاثر یامی رود دیوار کج

سب دوست ہنس پڑے۔ خالد کا قہقہہ ان سب سے بلند آہنگ تھا۔ جب یہ پُر لطف محفل ختم ہونے لگی تو خالد نے بتایا پرسوں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ راولپنڈی میں ان کے چھوٹے بھائی کے ہاں مقیم تھیں۔ خالد کے جانے کے بعد ہم سب سوچتے رہے کہ اس شخص کو اپنے جذبات پر کس قدر قابو حاصل ہے۔ اپنے صدمے کو نہ گفتگو سے ظاہر ہونے دیا اور نہ چہرے سے۔ آنسوؤں کا سیلاب اشعار میں بہہ نکلے گا۔

تین روز لاہور میں گزرے۔ کالجوں کے کھل جانے سے لاہور بھرا بھرا نظر آیا۔ چہل پہل ہما ہمی۔ ادبی، تہذیبی سرگرمیوں کی ریل پیل سری اسلام آباد سے بہت کم ہے۔ عبدالعزیز خالد قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کر رہے ہیں۔ کیا کہنے اس شخص کے۔ ہمیشہ ایک سے ایک بڑا

ادبی منصوبہ ان کے سامنے رہتا ہے۔ قرآن مجید کا منظوم ترجمہ ان کی ادبی زندگی کا سب سے بڑا کام ہوگا۔ ہم نے ان کو قریب سے دیکھا ہے۔ خالد کی تمام تر زندگی (ماسوائے اوقات دفتر) ادب کے لیے وقف ہے۔ کھانا وہ ایک وقت کھاتے ہیں۔ سماجی تقریبوں میں آنا جانا شاذ شاذ۔ سوتے فرش پر ہیں۔ بلکہ کتابوں پر سوتے ہیں۔ خانہ ہمہ کتاب خانہ۔ سوتے بھی کیا ہیں۔ بارہ ایک بجے شب کے لیٹ کر صبح تین بجے اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ یہ ان کا معمول ہے۔ بلا ناغہ اُٹھ کر ڈیڑھ دو گھنٹے ڈنڈ بیٹھک۔ چہل قدمی بلکہ تیز قدمی۔ روزانہ تین چار میل چلتے ہیں تاکہ قلم چلتا رہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اس نشست کے مہمانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر جالبی جتنا وسیع اور وقیع اَدبی و تہذیبی کام اب تک کر چکے ہیں اُس سے اُردو زبان کا کونسا طالب علم ناواقف ہوگا۔ ان کو نثر کا عبدالعزیز خالد کہنا چاہیئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں اصحاب محکمہ انکم ٹیکس میں ذمّے دار مناصب پر فائز ہیں۔ عبدالعزیز خالد کو تو ہم قریب سے جانتے ہیں۔ وہ تو دفتر کے بعد ہمہ وقت شعر و اَدب کے لیے وقف رہتے ہیں۔ قلم ہاتھ میں نہیں ہوتا تو کتاب ہوتی ہے۔ کھانا ایک وقت کھاتے ہیں۔ مجلسی زندگی پر "کانٹا" پھیر رکھا ہے۔ ٹیلی فون باورچی خانے میں بجتا ہے۔ فرش پر سوتے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر جالبی سے پوچھ ہی لیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ اپنی منصبی مصروفیت کے باوصف اس قدر وسیع تحقیقی کام کیونکر کر گزرے؟ ہم نے عبدالعزیز خالد کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی عرض کیا کہ وہ تو خیر شاعر ہیں۔ شعر لیٹے لیٹے بھی کہا جا سکتا ہے۔ گمر نثر لکھنے کے لیے تو گھٹنے توڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ دیکھئے ڈاکٹر جالبی کیا کہتے ہیں۔ مگر اُنھوں نے بھی وہی عبدالعزیز خالد والی "ڈرل" دوہرا دی۔ کہنے لگے، ضمیر صاحب! زندگی نہایت مختصر ہے۔ جوان نسل، بزرگوں کا دامن پکڑ کر پوچھتی ہے۔ یہ تو بتایئے کہ آپ نے کیا کام کیا؟ میں دفتر کا کام دفتر میں ہی کرتا ہوں۔ دفتر کو گھر میں نہیں گھسنے دیتا۔ دوپہر کا کھانا ڈٹ کر کھاتا ہوں۔ رات کو "سوپ" یا "جوس" کا وہی ایک پیالہ پیتا ہوں، جو میری بیوی رات کے ڈیڑھ بجے میرے لیے بنا کر لاتی ہے۔ جب تک میں لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف رہتا ہوں۔ یہ تقریباً روزمرہ کا معمول ہے۔ نہ اپنے دفتر کا ایک منٹ اپنے اَدب کو دیتا ہوں نہ اپنے اَدب کا ایک منٹ اپنے دفتر کو دیتا ہوں۔

محبی عبدالعزیز خالد، جب کبھی لاہور سے اسلام آباد آتے ہیں تو اُن کے ہاتھ میں اُن کی کوئی نئی کتاب بھی ہوتی ہے (عموماً دونوں

ہاتھوں میں ایک ایک نئی کتاب ہوتی ہے) اس مرتبہ "خروشِ خم" کا تحفہ لائے۔ اسلام آباد میں کل ڈیڑھ دن ان کا قیام رہا۔ اس میں سے بھی ایک شام کے لیے مری لٹریری سوسائٹی کے لطیف کاشمیری مری میں اور دوسری شام کو معروف ادیب و شاعر جمیل یوسف ان کو اُچک کر راولپنڈی کلب میں لے گئے۔ اصل میں تو مری کی ایک شام ہی کا پروگرام تھا۔ مگر مری کی شام میں ان کی صرف عربی اور فارسی شاعری پر اگلی شام کو راولپنڈی میں گفتگو ہوئی۔ خالد صاحب کا ایک کمال یہ ہے کہ پاکستان میں جو کچھ بھی اُردو زبان میں شائع ہوتا ہے وہ ان کے مطالعے سے گزر جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جو شخص خود اتنا زیادہ لکھتا ہے وہ اتنا زیادہ پڑھتا کیونکر ہے۔ ——— خیر یہ ایک الگ مسئلہ ہے، جس پر گفتگو کرنے کے لیے خالد صاحب کے ساتھ ایک تیسری شام منعقد کرنی پڑے گی۔ اس وقت اعجاز فاروقی صاحب کا مسئلہ زیرِ بحث ہے۔ ہمیں اس "حادثے" کا علم اگلے روز اس وقت ہوا جب خالد صاحب ہمیں اپنی مصاحبت میں رکھ کر، اسلام آباد میں اعجاز فاروقی صاحب کو اُن کے مذہبی مضامین کے نئے سلسلے پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا "ہمیں تو آپ کے اس رُخ کا علم ہی نہ تھا۔ اس پر اعجاز فاروقی نے جواب دیا۔ "خود مجھے اپنے اس رُخ کا کوئی علم نہ تھا۔ بات کھلی تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی اور اعجاز فاروقی ہیں۔ یعنی ان مضامین کا ہمارے اس اعجاز فاروقی کا کوئی تعلق نہیں جو اُردو ادب میں نقاد و شاعر کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں اور جن کی تصنیف "آدھی رات کا سورج" شاعری میں ایک چونکا دینے والا اضافہ سمجھی جاتی ہے۔ اعجاز فاروقی (آدھی رات کے سورج والے) کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اعجاز فاروقی (ڈائجسٹ والے) نے خاصا پریشان کر رکھا ہے اُنھوں نے (آدھے سورج) نے کہا ——— "اعجاز فاروقی صاحب (ڈائجسٹ) ممکن ہے کہ نہایت عمدہ مضامین لکھ رہے ہوں۔ لیکن میرا ان مضامین سے کوئی تعلق نہیں مگر ملک کے طول و عرض میں جواب دہی مجھے کرنی پڑ رہی ہے۔" ایک دوست کا ٹیلی فون تو ہمارے بیٹھے بیٹھے آیا۔

ایک مشہور شاعر کا مکتوب ملا

اشعار کی بھرمار پہ احوال ندارد

ذاتی طور پر بھلے آدمی ہیں۔ مگر آبائی شہر کی تاریخی شہرت داغ دار چلی آرہی ہے۔ وہاں کے لوگوں کا ——— "میں" اور "میرا" بہت موٹا ہے۔ یہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ پانی جس زمین سے نکلتا ہے اس کا لوہا چونا اپنے اندر رکھتا ہے۔ اَدبی تنقید کی آڑ میں اپنے ہم عصر شاعروں پر طنز کے تیر برساتے رہتے ہیں۔ میں عبدالعزیز خالد کے فن و فکر کا دیرینہ مدّاح ہوں۔

ایک مرتبہ یہ صاحب خالد کے ایک شعر کے بارے میں پوچھنے لگے "بتاؤ اس سے معنی کے کتنے ترشول نکلتے ہیں؟" میں سمجھ گیا ان کا مقصود میری علمی کم مائیگی کا مذاق اُڑانا تھا۔ سو میں ——— ہنس دیا۔ مسکرا دیا۔

اورنٹیل کالج لاہور میں ہم جب بھی ان (ڈاکٹر وحید قریشی) سے ملنے گئے۔ ان کو مشاہیر ادب کے جھرمٹ میں پھلجھڑیاں بکھیرتے پایا۔ کالج اورنٹیل تھا تو گھر "اورینٹ"۔ عبدالعزیز خالد، سر اکبر خاں ہوتی، کرنل ڈاکٹر عبدالعزیز مرحوم، کرنل خواجہ عبدالرشید مرحوم، اے ڈی اظہر مرحوم، سر محمد نواز آف فتح خان اور بریگیڈیئر گلزار کے ذاتی کتب خانوں کے بعد ہم نے اتنی وسیع اور وقیع ذاتی لائبریری کہیں نہیں دیکھی۔

اصل بات یہ ہے کہ شعراء کی "جدولی اولاد" کسی عروض کی پابند نہیں۔ خود ہماری کوئی نظم پچیس اشعار سے کم نہیں رہتی مگر بچے دو مصرعوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اصول تسکن کی سب سے بڑی روایت عبدالعزیز خالد کے ہاں نظر آتی ہے۔

وہ غزل ڈیڑھ ڈیڑھ سو شعر کی کہتے ہیں۔ لیکن بچے صرف تین ہیں۔ مگر دوسری طرف ان کی معنوی اولاد (کتابوں کی گنتی تیس سے اُوپر نکل چکی ہے۔ لہٰذا ان کے لیے تین بچے ہی بہت سمجھے جائیں گے۔ البتہ ایک کتاب والے ادیبوں کو ان سے سبق سیکھنا چاہیئے۔

لیجئے پاکستان کے صاحب طرز شاعر ہمارے دوست جناب عبدالعزیز خالد "لسان العصر" سے "خیاط العصر" ہو گئے۔ یعنی کمشنر انکم ٹیکس کے عہدے سے ان کو تبدیل کر کے حکومت پاکستان کے ادارہ ملبوسات کا "رفوگر اعظم" (مشیر مالیات) بنا دیا گیا ہے۔

پچھلے دنوں جب ہم نے یہ خبر سُنی تو ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ نہ ہو، حکومت کی نظر ان کی شاعری پر جا پڑی ہے" ادارہ ملبوسات" کا کام کپڑے کی کتر بیونت "تراش خراش سلائی کرنا ہے، حکومت نے سوچا یہ شخص شاعری میں الفاظ کو دوشالے اور لحاف ہی پہناتا رہا ہے اسے ادارہ ملبوسات میں کیوں نہ بھیج دیا جائے۔ کچھ عجب نہیں اگر کسی صاحب اختیار نے خالد صاحب کا یہ شعر پڑھ لیا ہو ۔

انار سینے پہ ہیں اور خال چہرے پر
لباس تنگ سے ابھرے تناسب اعضا

"ادارہ ملبوسات" میں اس منصب کے لیے مرکزی حکومت کے جائنٹ سیکرٹری کے درجے کا افسر مطلوب تھا، حضرت اکبر الہ آبادی تو شعر کہتے کہتے "ڈپٹی کلکٹری" تک ہی پہنچے۔ مگر آزادی کے بعد اُردو کے کئی شاعر اور ادیب خدا کے فضل سے بہت اونچے اونچے منصبوں تک جا چکے ہیں، اس خاص منصب کے لیے اگر جوائنٹ سیکرٹری کے درجے کا شاعر درکار تھا۔ تو ضیاء جالندھری، محبوب خزاں، اعجاز فاروقی، جاوید قریشی، صدیق کلیم، محب عارفی اور کئی دوسرے شاعر جوائنٹ سیکرٹری موجود تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اس محکمے کا "سوتی دھاگہ" نظم و نسق آسانی سے سنبھال سکتا تھا، افسانہ نگار مطلوب تھا، تو مسعود مفتی اور ڈاکٹر صفدر محمود اسلام آباد میں ہی مقیم تھے مگر افسانہ نگاروں کو غالباً اس وجہ سے ترجیح نہ دی گئی۔ مبادا وہ کپڑا زیادہ خرچ کریں۔ کترنیں زیادہ پھینکیں۔ یا سلائی میں جھول چھوڑ جائیں۔ نثر میں شاعری کی فٹنگ کہاں؟ جہاں تک ہلکے پھلکے بک فراک سینے کا تعلق ہے بے شک کوئی اچھا غزل گو شاعر یہ کام کر سکتا تھا۔ مگر یہ تو گف ملیشیا پر پائدار سلے کاری کا کام تھا۔ جس کو خالد کے ایک مصرعے کے مطابق ـــــ گندمی پنڈے میں لپٹنے کی باس۔ کہنا چاہیئے، تو جناب ہمارا کوئی مہربان خواہ مخواہ ہم سے خفا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ہمارے نزدیک تو اس محکمے کے لیے خالد ہی موزوں ترین شاعر تھے۔

بنا ہے کھیس تجمل حسین خاں کے لیے

ادارہ ملبوسات کا ایک دفتر اسلام آباد میں بھی قائم ہے کچھ روز ہوئے ہم نے خالد صاحب کو اس دفتر میں کارِ رفوگری کی جانچ پڑتال کرتے دیکھا۔ کپڑوں کو گز کے بجائے عروض سے ناپ رہے تھے۔ جو پارچات، وزن سے کم رہ جاتے اُن کو "اُترن" کے طور پر "ری جیکٹ" کر دیتے۔ سِلا ہوا کوئی جوڑا اُٹھاتے تو سب سے پہلے اس کا "بندِ قبا" کھولتے۔ خالد علم عروض کے بادشاہ ہیں۔ کبھی وہ عالم کہ بات بات میں "فاعلات" فاعلات" کی گردان رواں رہتی تھی۔ کبھی اب یہ حال کہ ـــــ گدری۔ آسن۔ آستر۔ شانہ۔ کمر۔ گھیرا۔ کترن۔ تیرہ جیسے تیرہ الفاظ جاری بر زبان دیکھے۔ فرائض منصبی میں ان کے انہماک سے اس بات کا احتمال ہے کہ آئندہ ان کے شعروں میں گدری، آسن اور تیرہ وغیرہ کے الفاظ وارد ہو کر رہیں گے یہ الگ بات ہے کہ گدری فارسی عربی میں "گدرانے" کے بعد کوئی معتبر چیز معلوم ہونے لگے۔ ہم حاضر ہوئے تو بجائے ہاتھ ملانے کے گھیرے میں ہاتھ ڈال کر ہمیں سالم کا سالم پکڑ لیا، قیاس ہے کہ آئندہ وہ ہمارے بچوں کی خیر و عافیت پوچھنے کے لیے پوچھا کریں گے۔

"کہو تمھاری کترنوں کا کیا حال ہے؟"

اُردو شاعروں میں محبوب کی کمر کا بڑا چرچا ہے جتنی پتلی کمر اتنا طرحدار محبوب، ماہرین میں ملبوسات کے ناپ تول پر بحث ہو رہی تھی،

ایک ماہرِ فن نے کہا۔ اگر کمر کو کافر رکھنا ہے تو گھیرے کو ۳۱ اِنچ سے نہ بڑھنے دو، مگر خالد صاحب کو جو۔ شعر میں "تہہ داری و تمثیل کے درجن ڈیڑھ درجن پہلو رکھنے کے حامی ہیں، یہ گنجائش ناکافی معلوم ہوئی۔ فرمایا۔ کل ۳۱/ اِنچ؟ میاں ۳۱ اِنچوں میں خیال کہاں لاؤ گے؟ مواد کس جگہ بٹھاؤ گے؟ اور تشبیہات استعارے، تلازمے کہاں جائیں گے؟

س:۔ شاعری کے حوالے سے کوئی خوشگوار واقعہ؟

ج ——— اور دوسرا تازہ ترین حادثہ رات عبدالعزیز خالد کے ہاں پیش آیا۔ میں ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ لکھنے کی تحریک ہوئی۔ فوراً میز پر سے ان کا پین اور کاغذ اُٹھایا اور خیالات کو کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن قلم نہیں لکھ رہا تھا۔ عبدالعزیز خالد سامنے بیٹھے میری ناکام کوشش کو دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے سمجھا کہ شاید روشنائی جو کاغذ اور قلم کے رشتے کو استوار کرتی ہے ختم ہو چکی ہے۔ پوچھنے لگے: "کیا سیاہی ختم ہو گئی ہے؟" میں نے برجستہ جواب دیا: "نہیں جناب! سیاہی تو ہے۔ لیکن پین چونکہ آسان اُردو لکھنے کا عادی نہیں ہے۔ اس لیے میرے ہاتھ سے لکھنے پر آمادہ نہیں ہو رہا!"

(سید ضمیر جعفری سے انعام الحق جاوید کی گفتگو)

اُردو میں عربی زبان کے ممتاز شاعر ہمارے دوست جناب عبدالعزیز خالد آج کل وفاقی حکومت اسٹیبلشمنٹ ڈویژن میں "افسر بکار خاص" کے عام عہدے پر "معلق" ہیں ——— "معلق" ——— ایک تو اس لحاظ سے کہ "وزیر بے محکمہ" کی طرح ——— "افسر بکارِ خاص" کے پاس بھی عموماً کوئی محکمہ نہیں ہوتا دوسری وجہ معلق ہونے کی یہ ہے کہ ان دنوں وہ چار مہینے کی چھٹی پر ہیں اور وہاں ہیں جہاں سے ان کی اپنی خبر نہ ٹی

نہیں آتی یعنی اپنی ذاتی لائبریری کی کتابوں اور رسائل کے انبار میں معتکف ہوئے بیٹھے ہیں۔

خالد صاحب کے بارے میں ہم نے دیکھا ہے ان کی اپنی خبر آئے یا نہ آئے لیکن وہ خبر کے "ذکس" میں اکثر رہتے ہیں کیونکہ ہر "میڈیا" (یعنی ہر مہیا بذاتی والی میڈیا نہیں) ان کی کوئی تصنیف چھپ کر منظر عام پر آجاتی ہے ان کی اپنی کتاب نہیں تو ان کے بارے میں کسی دوسرے کی کتاب چھپ جاتی ہے وہ بھی نہیں تو ان کی شخصیت اور فن و فکر سے متعلق کسی رسالے کا کوئی خاص شمارہ ہی منصۂ شہود پر آجاتا ہے۔ زندہ شاعروں، ادیبوں کی قدر افزائی میں خاص شماروں کی اشاعت کی روایت عام ہوتی جا رہی ہے جو ایک صحت مند روایت ہے۔ عموماً ایک شاعر ایک ہی شمارے میں نمٹ جاتا ہے ایک آدمی ایک ووٹ کی طرح ایک شاعر ایک خاص نمبر مگر خالد صاحب پر رسائل کے جتنے خاص شمارے شائع ہو چکے ہیں ان کا شمار کرنا مشکل ہو گیا ہے رسالہ "فانوس" اور رسالہ "تحریریں" نے تو ان پر خاص نمبروں کا ایک "با اولاد سلسلہ" شروع کر رکھا ہے ایک ہی نمبر کی تین تین چار چار مختلف جلدیں مقصود حجم کو مناسب حد میں رکھنا ہے تاکہ "خاص نمبر" گھر کے بھاری سامان مثلاً لحافوں کے صندوق ہی میں نہ رکھنا پڑ جائے بہر حال یہ ایک منفرد اعزاز ہے جس پر خالد صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں بلاشبہ آج نہ شاعری میں کوئی ان کا "ہم زبان" ہے نہ "خاص نمبروں" میں کوئی ان کا "ہم وزن"

ہم سنتے تھے ان کی مقبولیت "خاص نمبروں" اور خاص لوگوں تک ہی محدود ہو گی اگلے دن کراچی کے رسالہ "عدالت" سے اندازہ ہوا کہ ان کی شاعری کی جڑیں عوامی زمین میں بھی دور دور تک چلی گئی ہیں شاعری جتنی اونچی ہے جڑیں اتنی ہی گہری ہیں "عدالت" دراصل ماہوار کتابوں کے ایک سلسلے کا عنوان ہے جو نوجوان ادیب جلیس سلاسل کی ادارت میں شائع ہوتا ہے فروری کے شمارے میں، جو اسلامی قانون نمبر ہے جناب سلاسل نے ملک کی چند مشہور و مقبول شخصیتوں کے ناموں کی فہرست چھاپ کر جناب جنرل محمد ضیاء الحق سے سفارش کی تھی کہ وہ ان اصحاب میں سے بعض کو وفاقی حکومت میں مشیر اور بعض کو رہبر (سیکرٹری) مقرر کر لیں عبدالعزیز خالد کو "خزانہ" اور "صنعت و حرفت" دو محکموں کی "سکرٹری" کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔

خالد صاحب جیسے تجربہ کار اور فرض شناس افسر اور مشکل پسند شاعر کے لیے کوئی سا محکمہ بھی مشکل نہیں ہے وہ اصلاً انکم ٹیکس کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں جو خزانے کی کنجی سمجھا جاتا ہے۔

"صنعت و حرفت" پر ممکن ہے بعض لوگوں کو "اقربا پروری" کا شائبہ گزرے کہ جنرل حبیب اللہ کا کام عبدالعزیز خالد کیونکر کر سکتے تھے۔ مگر ان لوگوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ خالد صاحب "پاکستان گارمنٹس کارپوریشن" کے کرتا دھرتا رہ چکے ہیں۔ پھر خود شاعری میں کئی صنعتیں از قسم "صنعت تلمیع، صنعت تجنیس، مرتب و غیر مرتب۔ صنعت آذری وغیرہ عام برتی جاتی ہیں۔

جلیس سلاسل صاحب نے جنگلات کا محکمہ خالی چھوڑ دیا ہے۔ شاید ان کو اس محکمے کے لیے کوئی موزوں آدمی نہیں ملا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس محکمے کو عمداً خالی رکھا ہو کہ جب جنگلات خالی ہو رہے ہیں تو محکمہ کیوں بھر دیا جائے جنگلات کا مشیر اگر لکڑی کی کفایت کے خیال سے مقرر نہیں کیا گیا تو یہ الگ بات ہے، ورنہ جناب سلاسل یہ محکمہ بھی خالد صاحب کے سپرد کر سکتے تھے کہ ان کی شاعری چھتنار، گھنے، سایہ دار اور اونچے اونچے، چوڑے چوڑے لفظوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ جنگلات کے مشیر ہوتے تو درختوں کی جگہ اپنے الفاظ ہی کاٹ کاٹ کر جنگل میں پھینکتے جاتے۔ اس عمل میں کچھ جنگل بھر جاتا، کچھ ان کی کتابیں خالی ہو جاتیں۔

عبدالسلام خورشید

اب ایک اور "عزیز" کا ذکر ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ ہماری مراد عبدالعزیز خالد سے ہے۔ جن کے مجموعہ ہائے کلام اور کلام پر کتب اور خاص نمبر جمع کیے جائیں۔ تو ایک اچھی خاصی لائبریری بن جائے گی۔ خاص نمبروں کو دیکھ کر ہم سوچتے ہیں کہ جب ان کا صد سالہ جشن سنگرہ منایا گیا تو کیا کام کیا جا سکے گا۔ کہ سارا کام تو ہو گیا ہے اب ایک ہی چیز باقی ہے کہ اس بت مشکل پسند کے فرمودات کی شرحیں لکھی جائیں!

خالد کی شاعری پر رسالے نمبر چھاپتے ہیں تو اتنے ضخیم کہ انہیں ڈبوں میں رکھ کر تقسیم کیا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں ماہنامہ "ستارہ" نے خالد نمبر چھاپا۔ جسے ہاتھ میں اٹھانے کے لیے پہلے ڈنٹر پیلنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ لیکن ماہنامہ "تحریریں" نے ہم پر یہ احسان کیا ہے کہ پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل تین نمبر چھاپ دیئے ہیں۔ ایک وقت پر صرف پانچ سو صفحات کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ جو قابل برداشت ہے موخر الذکر دو نمبر انہی دنوں ڈبے میں بند ہو کر آئے ہیں۔ ہم اخبار نویس لوگوں کو ادب سے اتنا واسطہ نہیں ہوتا جتنا "خیریت" سے ہوتا ہے اور ان نمبروں میں "خیریت" کا ایک پہلو یہ ہے کہ

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اُردو شاعری میں شاید ہی کوئی ایسی شخصیت ہو جس کی صلاحیتوں پر مختلف النوع اور مختلف الزائے ادباء کا اتنا اتفاق رائے ہوا ہو۔ لکھنے والوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی ہیں اور مولانا عبدالماجد دریا بادی بھی اور سب سے بڑھ کر جناب غلام احمد پرویز بھی۔ نقادوں میں ڈاکٹر مالک رام اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا بھی حالانکہ خالد دبستان سرگودھا سے لاتعلق ہیں۔ شاعر حضرات نے بھرپور خراج تحسین ادا کیا ہے۔ سوائے فردوسی اسلام حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری کے جو اپنے سوا کسی اور کو شاعر مانتے ہی نہیں۔

"خیریت" کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو نقاد خالد کے سخت نکتہ چین ہیں۔ ان کی نگارشات بھی شامل ہیں۔ اور تیسرا پہلو یہ ہے کہ عبدالعزیز خالد نے اگرچہ مشکل پسندی کے الزام کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اسے اپنی مخصوص ڈکشن کا جزو لاینفک قرار دیا۔ لیکن آخر رائے عامہ سے متاثر ہو کر اب مشکل پسندی کو ترک کر رہے ہیں چنانچہ تازہ کلام میں جتاتی انداز بیان موجود نہیں ہے اور چوتھا پہلو یہ ہے کہ یار لوگوں کی نکتہ چینی پر زود نویسی کے باوجود ان کی تصانیف کا سکور ۸ تک پہنچ گیا ہے جو اُردو شاعری کی پوری تاریخ میں بے نظیر اور بے مثال ہے ہم شاعر نہیں ہیں اور نقاد بھی نہیں ہیں۔ شعر پڑھنے اور سننے کا اتنا ہی ذوق رکھتے ہیں۔ جتنا ایک عام شخص کو ہوتا ہے۔ خالد کا بیشتر کلام ہماری سمجھ سے بالا ہے اور اگر سمجھنے کی کوشش کی تو باقی سارے کام چھوڑنے پڑیں گے۔ لیکن جتنا کلام سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے یقیناً معترف ہیں کہ خالد کا مشاہدہ بہت تیز ہے اور ان میں شعریت بہت گھمبیر روپ میں موجود ہے اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے سارے تجربات و احساسات سے گزر رہے ہیں۔ وہ ہماری بات نہیں مانیں گے لیکن ہم اب بھی یہی کہیں گے کہ اگر وہ اپنے آسان کلام کا ایک مجموعہ مرتب کروالیں۔ تو بہت

خوب رہے گا۔ ویسے اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آنے والے زمانوں میں اُردو شاعری کی جو تاریخیں لکھی جائیں گی ان میں خالد کا تذکرہ ناگزیر ہوگا کیونکہ ان کا "سکور" بہت "ہائی" ہے۔

خالد ایک سرکاری افسر ہیں اور جہاں رہے کارکردگی کے لیے نام پیدا کیا۔ اس کے باوجود انہیں گہرے مطالعہ اور شاعری کے لیے اتنا وقت مل جاتا ہے۔ یہ ایک بہت حیران کُن بات ہے۔ سرکاری افسروں میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ اُنھوں نے تحقیق میں نام پیدا کیا تصنیف و تالیف کا بازار گرم کیا۔ لیکن ہر شخص کے کام کی کوئی حد رہی۔ یہ خالد ہی ہیں۔ جو ساری حدود پھلانگ گئے ہیں اس اعتبار سے وہ نابغہ روزگار ہیں۔ پچھلی صدی میں انگریز افسروں میں ایسی بہت سی مثالیں موجود تھیں۔ کہ افسروں نے فرائض منصبی بھی بدرجہ اولیٰ ادا کیے اور علمی خدمت میں بھی پیش پیش رہے۔ برّ عظیم کی جو تاریخیں سلاطین کے عہد میں لکھی گئیں۔ وہ انگریزی زبان میں منتقل ہوئیں تو انہیں افسروں کی بدولت سر رچرڈ ٹمپل کی مثال خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ جنھوں نے پنجابی زبان اور اس کی مختلف بولیوں کا مطالعہ کر کے ہمارے عوامی ادب کو چار ضخیم جلدوں میں بزبان انگریزی پیش کر دیا اور یہ وہ کام ہے جو کوئی مقامی باشندہ اب تک نہیں کر سکا۔

عبدالعزیز خالد اب "بُوتراب . . . . منقبت حیدرِ کرّار" منظر عام پہ لائے ہیں۔ اسے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب ان کی زبان کا بھاری پن کم ہو رہا ہے اسی کتاب میں خالد کے بارے میں چند مضامین بھی شامل ہیں ایک ابنِ انشاء مرحوم کا۔ ایک نسرین حبیب کا، جس کا عنوان ہے "عظمتوں کا پیکر" ایک ان کے پُرانے مدّاح اور اخبار نویس ارشاد احمد حقّانی کا، اور ایک کامل القادری کا، ان مضامین کے مطالعہ سے عبدالعزیز خالد کی پُرکشش شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ان کی ڈکشن کے جواب میں بھی بعض دلائل حاصل ہوتے ہیں۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کی دو کتابیں ملی ہیں۔ ایک "ماذ ماذ" اور ایک "طاب طاب" ان دونوں کا مطلب "طیّب طیّب" ہے۔ خالد کی مشکل پسندی یا دوسروں سے مختلف راہ اختیار کرنے کا جذبہ سب جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کے نام ایسے رکھے ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے ان کے علاوہ "حدیثِ خواب" کا دوسرا ایڈیشن بھی آگیا ہے ان چاروں کتابوں کو پڑھنے گا تو عبدالعزیز خالد کے ذوق کا تنوّع ہمارے سامنے آجاتا ہے وہ اس لحاظ سے اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئے شاعر ہیں کہ اُنہوں نے ایک نئی ڈکشن اختیار کی ہے۔ نئے موضوعات تلاش کیے ہیں نئے الفاظ اُردو میں داخل کئے ہیں اور لوگوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ لغت کا استعمال کیا کریں اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوں گے یہ وقت بتائے گا اصل میں موجودہ زمانے کا تقاضا یہ ہے کہ ہر تحریر کے

الفاظ آسان ہوں تاکہ قاری کو کوئی پریشانی لاحق نہ ہو۔ اور وہ آسانی کے ساتھ مطالب اخذ کرتا چلا جائے۔ بہرحال اگر خالد اس کوشش میں جزوی طور پر بھی کامیاب ہو گئے کہ لوگ لغت کے استعمال سے نکترائیں تو وہ اُردو زبان کے الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے میں ایک بڑا کردار ادا کریں گے۔ خالد کی کتابوں کے دوسرے ایڈیشن چھپنا اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ اپنے نئے اسلوب نگارش کو زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

ہم نے لکھا تھا کہ عبدالعزیز خالد اب بُتِ مشکل پسند نہیں رہے اور ثبوت کے طور پر اُن کی ایک غزل پیش کر دی۔ جس میں کوئی جناتی لفظ موجود نہیں تھا اور قارئین کو بتایا کہ اسی قسم کی دو اور غزلیں بھی نئی دہلی کے "رسالہ" بیسویں صدی" کے پاکستانی ادب نمبر میں درج ہیں۔ عین اسی دن معاصر "نوائے وقت" میں موصوف کا ایک انٹرویو چھپا۔ اس میں آپ نے اس مسئلے پر یوں اظہار خیال کیا۔ جہاں تک آسان و مشکل کا تعلق ہے۔ اس کا فیصلہ کیسے ہو اور کون کرے؟ دونوں اصطلاحیں اضافی ہیں جب تک نفسِ مضمون کا، اس کے سیاق و سباق کا تعین نہ کیا جائے۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ عبارت سہل و سلیس ہے یا گنجلک اور مغلق۔ اگر موضوع مخصوص الفاظ اور تراکیب کا تقاضا کرتا ہے اور وہ اس کے حسبِ حال ہیں تو ان کا استعمال مناسب بھی ہے اور ضروری بھی۔ شعر کا اسلوب سادہ ہو سکے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے لیکن یہ سادگی وہ ہے جو پُرکاری سے پیدا ہوتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ

سادہ الفاظ کی پرکاری کا
اب کہیں جا کے مجھے کشف ہوا"

خالد صاحب ہماری بات مان لیتے تو مکالمے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ رہی یہ بات کہ آسان اور مشکل اضافی اصطلاحیں ہیں۔ تو یہ صحیح نہیں۔ آسان وہ ہے جس کی سمجھ سب کو یا قارئین کی ایک بڑی تعداد کو آجائے۔ اور مشکل وہ ہے جسے سمجھنے کے لیے بعض اوقات لغات بھی مدد نہ دے۔ موضوع کے مطابق تراکیب کے استعمال کا بھی بنیادی نکتہ یہی ہے کہ ابلاغ ہو سکے۔

جناب خالد کے بعض فقروں پر لطائف کا گمان گزرتا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:

"جسم میں فالتو گوشت اور شعر میں فالتو لفظ نہیں ہونا چاہیئے"

دیکھئے کیسے لطیف انداز میں ڈاکٹر وحید قریشی پر چوٹ کر گئے؟ نامہ نگار نے پوچھا حفیظ جالندھری صاحب کا یہ بیان

کہاں تک صحیح ہے کہ ہندوستان میں پاکستان سے بہتر منظوم ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ جواب میں لکھتے ہیں:

"قبلہ حفیظ صاحب آج کل جو لکھ رہے ہیں یقیناً بھارت میں اس سے بہتر لکھا جا رہا ہے۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"شعر میں لفظ و معنی ایک دوسرے میں یوں پیوست و مدغم ہو جاتے ہیں۔ جیسے دودھ اور پانی۔"

خوب فرمایا۔ بس اتنی کسر باقی ہے کہ "لفظ و معنی" کی جگہ "معنی و لفظ" لکھ دیا جائے کیونکہ جدید شاعری میں معنی و لفظ کا تناسب اتنا ہی ہے جتنا آج کل کے دودھ میں دودھ اور پانی کا۔

ہم نے نامور شاعر عبدالعزیز خالد کو اس لیے خراجِ تحسین ادا کیا تھا کہ وہ فرضِ منصبی کی دیانت دارانہ ادائی کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی خدمت میں ایسے جذبہ و جنوں سے کام لے رہے ہیں جس کی مثال ہم نے کم دیکھی ہے۔ وہ صرف شاعر نہیں ہیں عالم بھی ہیں کہ انہوں نے شعر و شاعری جیسی ہلکی پھلکی صنف میں ایسی فلسفیانہ گہرائی پیدا کر دی ہے جو ان کے ہم عصروں میں دکھائی دیتی ہے لیکن کم کم۔ اور خراجِ تحسین کا شانِ نزول یہ تھی کہ موصوف مدتوں کراچی میں رہے اور اب لاہور آئے ہیں اور ہم نے سوچا کہ ان کی تشریف آوری کی اطلاع لاہور کے ادبی حلقوں تک پہنچ جائے۔ بر سبیلِ تذکرہ یہ بھی لکھ دیا کہ خالد کے شعری مجموعوں کی تعداد ان کے ہم عصروں کے مجموعوں سے زیادہ ہے۔ اس پر آغا صادق صاحب نے لکھا کہ:

"موصوف کے سترہ مجموعے چھپے ہیں۔ عدم کے بیس اور آغا صادق کے اُنیس گویا فن شماریات میں دسترس نہ ہونے کی وجہ سے ہم سے سہو ہو گئی۔ یوں بھی ریاضی میں ہم بچپن سے کمزور چلے آتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اگر میٹرک کے امتحان میں ریاضی کے پرچے میں کامیاب نہ ہوتے تو میٹرک سے آگے نہ بڑھنے پاتے۔"

اب جناب عابد نظامی نے لکھا ہے کہ:

"مجموعوں کی تعداد کی حد تک آغا صادق صاحب کی بات درست ہے لیکن اگر معیارِ اشعار کی تعداد کو بتایا جائے (اور غالباً یہی پروفیسر عبدالسلام خورشید کا مقصد تھا) تو بلاشبہ برصغیر کا کوئی شاعر عبدالعزیز خالد تک نہیں پہنچتا۔" میری عرض ہے کہ حضورِ والا! آپ مجھے ریاضی کے ایک اور

امتحان میں نہ ڈالیے۔ میں نے نہ عبدالعزیز خالد کے اشعار کو گنا ہے نہ عدم کے اشعار کو اور نہ آغا صادق کے اشعار کو، میں اشعار کو گنتا نہیں، تولتا ہوں۔ اور ڈنڈی مارنے کا قائل نہیں ہوں۔ میرا مطلب ہے شعوری طور پر! باقی رہی یہ بات کہ عدم اور آغا صادق بھی نامور شاعر ہیں۔ تو مجھے اس سے انکار نہیں۔ عدم کا مجموعہ "نقشِ دوام" عنفوانِ شباب میں پڑھا اور یقین کیجئے کہ اس سے بہت لطف اُٹھایا۔ آغا صادق کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن ان سے تعلّقِ خاطر ضرور رہے وہ میرے والدِ مرحوم مولانا عبدالمجید سالک سے خصوصی رابطہ رکھتے تھے۔ اس لیے ان سے روحانی تعلّق بھی ہے۔ اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اب سے بائیس تئیس برس پہلے میں نے انقلاب میں ان کی ایک نظم چھاپی جس کا عنوان تھا "شراب کی دکان پر پرچم پاکستان دیکھ کر" اس پر صوبے کی حکومت وقت اتنی ناراض ہوئی کہ اخبار کو ایک بڑی آزمائش میں ڈال دیا۔"

عبدالعزیز خالد پھر لاہور آ گئے۔ اور سچ پوچھئے تو گئے ہی کب تھے؟ جب پہلے پہل تبدیلی کا حکم آیا تو ان کی محبوب بھاری بھرکم اور بیش قیمت لائبریری راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ عشق غالب آیا۔ خالد نے طویل چھٹی لے لی۔ چھٹی ختم ہوئی تو مجبوراً لائبریری کو داغِ مفارقت دینا پڑا۔ کراچی گئے تو اکھڑے اکھڑے رہے۔ شاید لذتِ فراق سے آگہی نے شعر کے نئے مضامین القا کیے ہوں۔ ان کا دل لاہور ہی میں رہا۔ پس جس نے بھی خالد کی لاہور میں تبدیلی کا حکم صادر کیا وہ علم دوست آدمی معلوم ہوتا ہے۔ خالد کوئی چھوٹا سا شاعر تو نہیں کہ نظر نہ آ سکے۔ دنیائے شعر کا چمپئین ہے۔ کیونکہ شعری تصانیف کا جتنا سکور اس نے کیا ہے۔ اس کی مثال ادب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مشکل پسندی میں خالد سب سے آگے ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے جغادری اہلِ علم اس کا کلام پڑھتے ہیں تو بغلیں جھانکتے ہیں کہ بہت سے الفاظ کے معانی ہی نہیں آتے۔ ویسے اب خالد نے ہم جیسے عوام کے لیے بھی شعر کہنے شروع کر دیئے ہیں اور اب ملاحظہ فرمایئے خالد کی تیسری خصوصیت۔ اس پر ادبی رسائل نے جو خاص نمبر چھاپے ہیں ان کا وزن کیجئے اور غالب و اقبال کو چھوڑ کر باقی شعراء پر شائع شدہ نمبر تو لیے۔ خالد سب پر بھاری ہو گا۔ اس کی شاعری پر کتابیں

جس رفتار سے آ رہی ہیں اگر وہ جاری رہیں تو اس مقابلے میں بھی سارے ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے۔ ہم لاہور میں خالد کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا۔ ایک ادبی شخصیت کراچی کی مجلسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر لاہور میں آ بسی لیکن بڑی خاموشی کے ساتھ ہم چاہتے ہیں یہ خاموشی ٹوٹے۔ اس لیے اس کی آمد کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔

نام : عبدالعزیز خالد

عمر : چوالیس سال

عہدہ : اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس

ہمیں ان سے پیار ہے اس لیے نہیں کہ وہ انکم ٹیکس کے محکمے سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ نہ ہمیں دولت چھپانے کی شوق ہے اور نہ اتنی دولت موجود ہے کہ اُسے چھپانے کی ضرورت محسوس ہو۔ ہمارے پیار کی شانِ نزول تو یہ ہے کہ آج کے دور میں شریفوں کی بڑی کمی ہے اور عبدالعزیز خالد ایک نہایت شریف آدمی ہیں۔ اُن کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اعلیٰ پائے کا شاعر ہونے کے باوجود احباب کو شعر سننے پر مجبور نہیں کرتے۔ شاید اس لیے کہ اُن کے کلام سے لطف اندوز ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اُسے آرام سے بیٹھ کر پڑھا جائے۔ وہ اس لحاظ سے چوٹی کے شاعر ہیں کہ اُن کے کلام کے بہت سے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ اتنے مجموعے کہ تعداد کے لحاظ سے کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر ہر مجموعہ طباعت کاغذ اور گیٹ اپ کے اعتبار سے حسن و جمال کا مظہر مکمل ہے۔ ہم نے کتابت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ سارے مجموعے ٹائپ میں چھپے ہیں۔ ظاہری حسن و جمال کے پہلو بہ پہلو باطنی حسن و جمال بھی جلوہ افروز ہے۔ وہ ایک طرف یونانی دیومالا اور دنیا کے بہترین کلاسیکی ادب سے روشنی اخذ کرتے ہیں تو دوسری طرف آسمانی صحیفوں کی ضیا بار کرنوں سے بھی فیضیاب ہوتے ہیں۔ السنۂ شرقیہ میں انھیں گہرا درک حاصل ہے۔ بالخصوص عربی زبان میں اپنے کلام میں عربی کے الفاظ کو اس چابک دستی سے سموتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور موضوع کا تقاضا ہو تو ہندی کے الفاظ بھی اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والے عش عش کر اُٹھتے ہیں۔ موضوعات کا تنوع ایسا ہے کہ جہاں گیتا نجلی، سلومی، سمسون و دلیلہ اور سیف الملوک کی داستانوں کو منظوم تمثیل کے رُوپ میں پیش کیا اور یونان کی مشہور شاعرہ سیفو کا کلام اُردو میں منتقل کیا۔ وہاں "منحنا" اور "فارقلیط" میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت انتہائی عقیدت اور پیار کے ساتھ شعر کے رُوپ میں

پیش کر دی ہے۔

عبدالعزیز خالد کا کلام پڑھتے ہوئے ہمیں مسلسل احساس ہوتا ہے کہ اُن کا اسلوبِ نگارش اپنے ہم عصر شعراء سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ انھوں نے ایک نیا راستہ اختیار کر رکھا ہے ایک ایسا راستہ جو عشق و محبت کے عام احساسات کے ساتھ ساتھ گہرے مطالعہ کا شوق بھی دلاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر کراچی کی تجارتی فضا میں انھوں نے اتنے بیش قیمت شہپارے لکھ ڈالے تو لاہور کی ادبی اور ثقافتی فضا میں رہ کر تو قیامت ہی ڈھائیں گے۔

لکھنے والوں کی ایک مختصر محفل تھی۔ ادیبوں کی حالت پر تبادلہ خیالات ہو رہا تھا کہ اچانک ایک انشاء پرداز نے سوال اُٹھایا کہ ادب کی تخلیق کو کیوں جز وقتی کام قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا قدرتی جواب یہ تھا کہ اگر کوئی ادب کی تخلیق کو کل وقتی مشغلہ بنائے تو روٹی کہاں سے کھائے اور بال بچوں کا پیٹ کیسے پالے۔ ایک اچھے شاعر نے کہا:

> "معاشرے کا فرض ہے کہ اس کام میں مدد دے۔ مثلاً اگر کوئی ادیب سرکاری ملازم ہے تو اُسے ملازمت کے فرائض سے عملاً آزاد کر کے تخلیق ادب کے لیے وقف کر دیا جائے۔ اور وہ گھر بیٹھے کام کرے اور تنخواہ سرکار کے خزانہ عامرہ سے وصول کرے۔ جب وہ ادیب فکرِ معاش سے آزاد ہو جائے گا اور پورا وقت خاطر جمع ہو کر ادب کی تخلیق میں صرف کرے گا تو ظاہر ہے وہ بہتر ادب پیدا کرے گا۔"

اس پر محفل والوں کے کان کھڑے ہوئے۔ کیونکہ یہ تجویز بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اس پر ہم نے کہا کہ تقریباً سب بنکوں میں اور پی۔ آئی۔ اے میں بعض ایسے افسر ہیں جو نارمل فرائض ادا نہیں کرتے اور نہ ان سے ایسی توقع کی جاتی ہے کیونکہ انھیں کھلاڑی ہونے کی حیثیت سے ملازمتیں دی جاتی ہیں۔ وہ سارا وقت اپنے اپنے مخصوص کھیل کی مشق کرتے ہیں اور تنخواہیں متعلقہ بنکوں یا پی۔ آئی۔ اے سے پاتے ہیں۔ یہی کھلاڑی ان اداروں کی ٹیموں میں شامل ہو کر میچ کھیلتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر بنک اور پی آئی۔ اے کھلاڑیوں کے لیے ایسا بندوبست کر سکتے ہیں۔ تو ادیبوں، دانش وروں اور محققوں کے لیے کیوں نہیں کر سکتے؟ یہی دوسرے اداروں پر بھی صادق آتا ہے۔ ہم یہ تجویز اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے حوالے کرتے ہیں تاکہ اس پر ہمارے کرم فرما جناب مسیح الدین احمد صدیقی غور فرمائیں۔ دوسرے لکھنے والوں سے مشورہ کریں۔ اداروں سے گفتگو کریں۔ اور اس کی روشنی میں کوئی

ایسا منصوبہ تیار کریں جو تخلیقِ ادب کو کل وقتی مشغلہ بنانے میں مدد دے۔

ایک مسئلہ ضرور درپیش ہوگا کہ اس ملک میں ہر تیسرے آدمی کو ادیب ہونے کا داعیہ ہے۔ جن میں شعرا سرِفہرست ہیں اگر کوئی ایسا منصوبہ بنا تو ظاہر ہے صرف چند گنے چنے افراد کے لیے سہولت مہیا ہو سکے گی تو ان کا تعین کس طرح ہو؟ معاف کیجیے گا اس کا جواب ہمارے پاس موجود نہیں لیکن اس میں روٹیشن یا گردش کا اصول لاگو کیا جائے تو زیادہ ادیب فائدہ اٹھا سکیں گے یہ اسی طرح ہو کہ اگر کسی سرکاری محکمے میں عبدالعزیز خالد قسم کا کوئی شاعر موجود ہو جو علم و فضل کے پتلے ہیں اور جن کے شعری ذوق کو کوئی نہیں للکار سکتا۔ تو بہتر یہ ہے کہ ان سے ادبی تخلیق کا زیادہ کام لینے کے لیے انھیں ایک آدھ سال کے لیے فرائضِ منصبی سے آزاد کر دیا جائے اگر اکادمی ادبیات پاکستان جیسے کسی ادارے کے نزدیک اس مختصر مدت میں کام خاصا ہوا ہو۔ تو انھیں توسیع دی جائے ورنہ فرائضِ منصبی انھیں لوٹا دیے جائیں۔

ہم لوگ اور ہماری طرح کے بہت سے دوسرے لوگ جہاں عبدالعزیز خالد کی ہفت زبانی اور شاعرانہ صلاحیتوں کو خراجِ تحسین ادا کرتے رہے ہیں وہاں کوئی نہ کوئی ادبی زبان سے اور کوئی دھڑلے کے ساتھ انھیں بہت مشکل پسند بھی کہہ دیتا تھا۔ اور انھیں تلقین کرتا تھا کہ شاعری کا مقصد ابلاغ ہے ابلاغ کے لیے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد آپ کی بات سمجھیں اس لیے مشکل الفاظ کی جگہ آسان الفاظ استعمال کریں۔ یہ سن کر عبدالعزیز خالد ہنس دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم اپنی جہالت کی ذمہ داری میرے کاندھوں پر کیوں ڈالتے ہو۔ اگر تمھیں کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا تو لغت دیکھو کہ میرا تو یہ مخصوص انداز ہے یہ میری ڈکشن ہے جو مجھے دوسروں سے ممیز کرتی ہے اس لیے یہ تو رہے گی اور یوں ہم اپنے اپنے اختلافات بجائے خود رکھتے ہوئے باہم رفیق بنے رہے جو اشعار سمجھ میں آئے ان سے لطف اندوز ہوئے اور جو نہ سمجھے۔ انھیں نظرانداز کر دیا کیونکہ بار بار لغت دیکھنے کی ہمیں عادت نہیں۔

عبدالعزیز خالد سے روابط کو ایک تہائی صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ اس دوران میں انھوں نے پینتیس کے قریب کتابیں لکھ ڈالیں۔ اب "فارقلیط" کا چوتھا ایڈیشن ملا اور اگرچہ ہم نے یہ پہلی بھی پڑھ رکھی تھی۔ لیکن سوچا قندِ مکرر ہی سہی ہمارے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ اب خالد بہت کم مشکل پسند نظر آتے ہیں اور ہم بڑے مزے سے اور لطف لے کر

ساری کتاب پڑھ گئے تھے۔ اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت تو ہونی ہی تھی۔ سنسکرت اور ہندی کے الفاظ بھی تھے اور سارے سمجھ میں آتے گئے تھے اور ہم سوچتے تھے کہ آیا اس میں عبدالعزیز خالد کی خوبی ہے یا ہماری خالد کی اس لیے کہ اس نے اپنی نظم کے بہت سے مشکل الفاظ سے ہمیں واقف کرا دیا اور ہماری اس لیے کہ ہم نے اپنا علم اتنا بڑھا لیا کہ خالد کا کلام بھی سمجھنے اور پسند کرنے لگے لیکن ہم نے کوئی ایسی شعوری کوشش نہیں کی اس لیے سہرا خالد ہی کے سر ہے۔

می گفت مسیح در بشارات جلیل
من می روم آید ء جہاں فارقلیط

خالد بتاتے ہیں فارقلیط مرکّب لفظ ہے فارقلیط۔ فارق بہ معنی پھاڑنے والا یا سر کچلنے والا لیط بہ معنی شیطان رجیم یعنی شیطان کا سر کچلنے والا سو جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔

"فارقلیط" کا موضوع حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے اسے ایک طویل نعت کہہ لیجئے جو سات "کتابوں" میں منقسم ہے یا اسے منظوم سیرت رسول کہہ لیجئے۔ یوں تو ہر شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے بے پایاں پیار ہے۔ لیکن خالد کا پیار کچھ انوکھا کچھ نیا اور کچھ ایسا ہے جو اس سے پہلے شاید کسی نے نہیں کیا اور پھر جو کچھ کہا ہے سند کے ساتھ کہا ہے گویا "فارقلیط" پیار کی ایک مستند داستان ہے اور ایک یہ کمال ہے کہ ۱۵۲۰ شعر کی ایک ہی نظم ایک ہی قافیے اور ردیف میں قلمبند کر دی ہے جو قادر الکلامی کا ایک بڑا ثبوت ہے!

اس کتاب سے انتخاب پیش کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے اس لیے پہلے چند شعر پیش کیے دیتے ہیں۔

مَیں فرشِ زمیں ہوں تو سقفِ سما ہے
مَیں سانسوں کا مہماں تو موجِ ہوا ہے

قلمبند ہو کس طرح برگِ نَے سے
بیاں تیرے حسنِ گلو سوز کا ہے؟

شہنشائے لولاک و مولائے سدرہ
تو میرے تخیّل سے بھی ماورا ہے

تری ذات فخرِ بنی نوعِ انسان
تو صلِّ علیٰ خیرِ خلقِ خدا ہے

دمِ گفتگو کو منہ سے کرنوں کی بارش
دہن مہرِ تاباں کو شرما رہا ہے

جو بنتِ معوذ سے پوچھا تو بولیں
سمجھ لو کہ مشرق سے دن چڑھ رہا ہے

ترا چہرہ مُصحف کا زر کار ورقہ
تو قرآنِ ناطق نہیں ہے تو کیا ہے؟

عبد العزیز خالد کے بارے میں ایک نیا انکشاف ہُوا ہے کہ وہ اپنا کلام ترنم سے بھی سناتے ہیں اور وہ بھی کس ٹھاٹھ سے؟۔ یہ بات کامل القادری کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:

"اصل معاملہ یہ ہے کہ خالد صاحب سہگل کے دیس میں ہیں اور نہ معلوم یہ اس دھرتی کا اثر ہے یا کوئی اور بات۔ خالد صاحب کی آواز میں سہگل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اگر اس طرف قدرے اُنھوں نے توجہ دی اور آواز پکائی تو ان میں واقعی اچھے موسیقار ہونے کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ ذرا ریاض کی ضرورت ہے۔"

بات تو اچھی ہے، لیکن سوال یہ ہے خالد صاحب کس کس چیز میں ریاض کریں گے۔ شعر و شاعری میں جو ریاض کر چکے ہیں۔ یا کر رہے ہیں، وہ سب کے سامنے ہے۔ اکیس کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں پانچ تیسرے ایڈیشن بھی ہیں گیارہ دوسرے ایڈیشن ہیں۔ باقی پہلے ایڈیشن میں "زیرِ طباعت" ہیں اور خالد کے مداحین ریاض میں ان سے بھی چار قدم آگے ہیں۔ کسی زمانے میں "ستارہ" نے حضرت نعیم صدیقی کی رہنمائی میں ایک بھاری بھرکم خالد نمبر نکالا تھا جو بے پناہ ضخامت کی وجہ سے ڈبے میں پیش کیا گیا اس کے بعد محترمہ زاہدہ صدیقی کے ماہنامہ تحریریں نے ایک نمبر چھاپا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وہ محض قسطِ اوّل تھا۔ اور اب ایک ہزار صفحات پر مشتمل دو اور قسطیں آ رہی ہیں۔ لاہور میں ایک ماہنامہ "فانوس" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس نے دو تین یا شاید اس سے بھی زیادہ مختصر خالد نمبر چھاپے اور اب ایک

نئی مہم پر نکلا ہے ۔ ابھی ابھی تین سو صفحات پر مشتمل ایک نمبر شائع کیا ہے ۔ لیکن اسے نمبر نہیں مقدمہ قرار دیا ہے ۔ اصل نمبر زیر طباعت ہے اور اس کے بھی ایک ہزار صفحات ہوں گے ۔ طرّہ یہ کہ اس کا مواد صرف اُردو میں نہیں ہو گا ۔ عربی، فارسی، پشتو، پنجابی، سرائیکی، سندھی، بلوچی اور انگریزی حصے بھی ہوں گے ۔ ان نمبروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ خالد کے ساتھ ادبی شاموں کی جو روداد اخباروں میں بکھری پڑی ہے اسے بھی ایک جا کر دیا گیا ہے ۔ بے شمار ادیبوں کی آرا جمع کر دی گئی ہیں سوائے حضرت حفیظ جالندھری کے، کیونکہ وہ تو اپنے سوا کسی اور کو شاعر مانتے ہی نہیں ۔ جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی اور فیض احمد فیض کو اقلیم شعر سے باہر نکال چکے ہیں اور ابھی خدا جانے اور کس کس کے اخراج کا حکم ہو گا ۔

خدا کی شاعری پر تین کتابیں بھی آگئی ہیں "مہمات خالد" "خالد ۔ ایک نیا آہنگ" اور "خالد شخص و شاعر" خالد نے ادبی دنیا میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کئی ریکارڈ توڑ ڈالے ہیں ۔ تصانیف کی تعداد میں ان کے ایڈیشنوں کی تعداد میں اور خاص نمبروں میں ۔ اب اگر انھوں نے موسیقی میں بھی ریاض شروع کر دیا تو کیا ہو گا ؟ اس کا اندازہ خود ہی کر لیجئے گا ۔ ہم انھیں ایک چیز کے بارے میں متنبہ کیے دیتے ہیں کہ ایسی صورت میں حفیظ جالندھری ان کے خلاف ہو جائیں گے ۔ کیونکہ وہ موسیقی میں خاص درک رکھتے ہیں اور اس دائرے میں خاص چیلنج کے روادار نہیں ہوں گے ۔ ہمارے لیے بھی مصیبت پیش آئے گی ۔ عبدالعزیز خالد بھائی ہیں اور حضرت حفیظ چچا اور ہماری دونوں سے آشنائی ہے ۔

پچھلے دنوں تین دوست غریب خانے میں تشریف لائے ۔ عبدالعزیز خالد، مشفق خواجہ اور نوجوان بارِش چنچل دانشور تحسین فراقی، عبدالعزیز خالد کو دیکھ کر ہم کچھ حیران ہوئے ۔ کیونکہ اب ہم ہی انھیں ملنے جاتے ہیں وہ عرصے سے نہیں آئے ۔ ہم نے دو ایک بار نہ آنے کا سبب پوچھا تو انھوں نے ایک عجیب و غریب عذر پیش کیا کہ پوتوں اور نواسوں میں مصروف رہتا ہوں تعجب کی بات ہے کہ پوتے اور نواسے (خدا انھیں سلامت رکھے) ہم سے ملاقات میں حائل ہوتے ہیں لیکن خالد کے سلسلہ تصنیف و تالیف میں رکاوٹ نہیں بنتے کیا معلوم ۔ پوتوں اور نواسوں کا ذکر وہ استعارے کے طور پر بھی کرتے ہیں کیونکہ ان کی نجی لائبریری بھی نہایت شاندار ہے ۔ اور یہ زیادہ تر وقت اسی اولاد کے ساتھ بسر کرتے ہیں اور فکر شعر میں بھی غرق رہتے ہیں ۔ ان دنوں غالبا قرآن حکیم کا منظوم ترجمہ کر رہے ہیں ۔

آج ایک عرصے کے بعد اس کالم میں عبدالعزیز خالد کے تذکرے کی شان نزول کیا ہے؟ اس کا جواب ذرا تفصیل چاہتا ہے۔ ہمیں بزرگوں نے بھی یہی سکھایا ہے کہ ہمیشہ سادہ زبان لکھو تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔ کچھ عرصہ آزادی سے پہلے ایسے سرکاری جرائد میں کام کیا جہاں ہدایت تھی کہ تحریر میں سلاست اور سادگی اتنی ہو کہ ہندی رسم الخط میں بھی لکھی اور پڑھی جاسکے۔ یہ کام بہت مشکل تھا لیکن ہم کبھی کبھی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد آزاد عملی صحافت سے وابستہ ہوئے تو پرانی عادت نہ چھٹی اس لیے کہ ہمارا خیال بھی یہی تھا کہ تحریر اتنی سادہ زبان میں ہو کہ کسی کو پڑھتے وقت لغت سے استفادہ نہ کرنا پڑے اس لیے اب بھی ہماری عادت ہے کہ جہاں کوئی مشکل الفاظ لکھنے پڑے کوشش یہی کی کہ ان کے آسان مترادف ڈھونڈھ لیے جائیں۔ پس ہم کہا کرتے ہیں کہ آسان اُردو لکھتے لکھتے ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ مشکل الفاظ یا بھاری بھر کم الفاظ ہمیں آتے ہی نہیں۔ اور اگر آتے ہیں تو انھیں قلم بند کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

عبدالعزیز خالد نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں زیادہ تر منظوم بہت کم منثور اور کچھ تراجم بھی ہیں۔ اور ہم نے ان کی بیشتر کتابیں پڑھی ہیں اور ان سے لذت اندوز ہوئے ہیں۔ خالد میں بھی یہ خوبی ہے کہ نازک سے نازک معاملات کو شعر کا موضوع بنا لیتے ہیں۔ مثلاً نعتیہ کلام خاصا ہے سیرتِ رسول پر منظوم کتابیں موجود نہیں۔ آج کل قرآن حکیم کا منظوم ترجمہ کر رہے ہیں جو نہایت مشکل کام ہے اور دوسری طرف ان موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں کہ جو ابتداء سے شاعروں کی ریت چلی آتی ہے مثلاً عشق و عاشقی اور کبھی کبھی اس میں تجاوزات بھی کر جاتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ان کے تجاوزات پر کوئی معترض نہیں ہوتا اور نعیم صدیقی جیسے متشرع اور متدین بزرگ اپنے رسالے "سیارہ" کا عبدالعزیز خالد نمبر چھاپ لیتے ہیں۔ ویسے بہت سے رسالوں نے ان پر نمبر چھاپے ہیں۔ بات کہیں سے کہیں نکل گئی ہے ہمیں کہنا یہ تھا کہ خالد کے کلام میں اکثر عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ کی بہتات ہوتی ہے جو عام لوگ اور ہم جیسے لوگ نہیں سمجھتے اور اپنی جہالت کا اعتراف کرنے کے باوجود خالد کہتے ہیں کہ آپ کی زبان مشکل ہے لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے کہ عبدالعزیز خالد نے اُردو ادب میں جو نئے الفاظ داخل کیے ہیں یہ بھی ایک بڑی خدمت ہے کہ زبان کا ذخیرۂ الفاظ بہت بڑھ گیا ہے ان میں سے چند چالو ہو جائیں گے اور "مشکل" نہیں رہیں گے اور بعض دوسرے لوگوں کے عدم استعمال سے معدوم ہو جائیں گے۔

ہم جب خالد سے ملے ہم نے کہا کوئی نئی کتاب لکھی؟۔ اگر ہماری سمجھ میں آنے والی ہو تو دیکھیے اس پر وہ ہنس پڑتے اور کہتے نئی کتابیں تو لکھتا ہی رہوں گا لیکن ایسی نہیں لکھی جو تمھاری سمجھ میں آسکے۔ ایک دفعہ ہم نے ایک اخبار میں پڑھا کہ

عبدالعزیز خالد نے "مہابھارت کتھن مالا" نام کے ہندوؤں کی کلاسیکی اور مقدس کتاب کا ایک انتخاب اُردو نثر میں چھاپا ہے۔ یہ تبصرہ نہیں تھا محض تذکرہ تھا شاید اس لیے کہ نامہ نگار سے یہ بظاہر ثقیل کتاب پڑھی نہیں جا سکی۔ ہم نے خالد سے کہا کہ مہابھارت کتھن مالا کا ایک نسخہ مجھے بھیجئے چنانچہ انھوں نے بھیج دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس میں مشکل الفاظ کے معانی ساتھ ساتھ لکھے ہیں اس لیے لغت دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم نے تین سو ساٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی ساری کتاب پڑھی اس میں کچھ مشکل پڑی لیکن اسے عبور کر لیا اور سوچا جب عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ بہتات سے استعمال کرنے والا اردو ادیب سنسکرت اور ہندی کا اتنا مطالعہ کر سکتا ہے کہ مہابھارت کی رُوح کو اصل متن سے کھینچ کر اُردو میں منتقل کر دے اور ساتھ ہی ہمارے معلّم کا فرض بھی ادا کرے کہ بے شمار اصل سنسکرت الفاظ درج کر کے ان کے اُردو تراجم سے آگاہ کر دے تو ہمیں تھوڑی سی مشکل تو ضرور برداشت کر لینی چاہیئے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اصل بات یہ ہے کہ خالد حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے بہت قائل ہیں کہ حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے جو جہاں سے بھی ملے مومن اس پر فوراً قبضہ کرے کہ وہی حکمت کا اصل وارث ہے اسی حدیث پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے "مہابھارت" کا انتخاب مرتّب کیا ہے اس کتاب کے تین حصے ہیں:

اول . . . . حکمت

گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر دایابی بگیر

اس میں پانچ ابواب ہیں:

دوم . . . . حرف

نمونے حسن اسلوب بیاں کے
اور استدراج و نیرنگِ جہاں کے

سوم . . . . حکایت

چند دلچسپ کتھائیں
جو حقیقت بھی ہیں افسانہ بھی
غمِ دنیا بھی ہے جن میں غمِ جانانہ بھی

آدھی کتاب حکمت کے ابواب پر پھیلی ہوئی ہے اور اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ سچائیاں اور صداقتیں ہر مذہب میں ہوتی ہیں کسی میں زیادہ کسی میں کم لیکن بے شمار سچائیاں ہندو مذہب اور اسلام میں مشترک ہیں مثلاً

"یہاں کوئی چیز کسی کی نہیں ایشور کا مال ہے جس کو چاہے دے جس سے چاہے چھینے ہر ایک چیز جو میں مانگ دی (ادھار) ملی ہے جو چیز اپنی نہیں ہے وہ قرض ہے"

"تیرے داتا نے اگر تجھے بن مانگے دے رکھا ہے تو گردن فرازی نہ کر نہیں تو تجھ سے
چھین کر دوسرے کو دے دے گا

"جب تو کسی کے رونے میں شریک نہیں ہوا تو تیرے آنسو کون پونچھے گا"

"کوئی سوال کرے تو اُسے ترشروئی سے جواب نہ دو"

محض چند ایسے اقوال ہیں جن میں سب الفاظ آسان ہیں حکمت کے پانچ ابواب میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلّق رکھنے والے انسانوں کے لیے ہدایات ہیں ان سے یہ حقیقت بھی اُبھرتی ہے کہ ہندو مذہب میں وحدانیت کا تصوّر موجود ہے لیکن ہمارے تصوّر سے مختلف ہمارا تصوّر بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ "حکایت" کے تحت وہ قصّے اپنی اصل صورت میں موجود ہیں جو ہم نے "شکنتلا" "ساوتری" "نل دمینتی" وغیرہ کے عام کتابوں میں پڑھ رکھے ہیں۔ یہ ہندو دیو مالا کے مظہر ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دیو مالا کی کہانیاں ہمیشہ عجیب و غریب واقعات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ بہرحال اس کتاب سے ہندو مذہب کا اخلاقی پہلو بھی واضح ہوتا ہے اور دیو مائی پہلو بھی اور عبدالعزیز خالد نے اس کا انتساب یوں کیا ہے۔

ہندو پاکستان کے اِس مشترک ماضی کے نام

جس میں

پوشیدہ ہے اک مستقبلِ نو کا پیام

اور

آج کل پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تہذیبی اور ثقافتی رشتوں کا جو چرچا ہے اس کے پیشِ نظر ہمیں ہندوستان کی غالب اکثریت کے نظریات سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

انتظار حسین

اس شہر سے ایک ادیب کم ہو گیا۔ ویسے تو ماشاء اللہ یہاں اتنے ادیب ہیں کہ پوری کیمپ نکل جائے۔ پھر بھی ادیبوں کی کمی نہیں پڑ سکتی۔ لیکن عبدالعزیز خالد تو اپنی ذات میں اتنے بھاری ہیں کہ جب وہ کسی شہر سے نکلتے ہیں تو اس کا پلّہ سبک ہو جاتا ہے جس شہر میں جا کر قیام کرتے ہیں اس کا پلّہ بھاری ہو جاتا ہے۔ کراچی سے نکل کر لاہور آئے تھے تو وہاں کی ترازو کے شعر سبک ہو گئی۔ اور لاہور کا پلّہ گراں ہو گیا۔ اب ہم نے آج شبنم رومانی کے کالم میں عبدالعزیز خالد کے کراچی میں ہونے کا ذکر پڑھا تو پتہ چلا کہ پچھلے دنوں سے ہمیں لاہور کا پلّہ کیوں ہلکا نظر آ رہا ہے۔

عبدالعزیز خالد اس شہر سے جاتے جاتے بھی ایک ایسا کام کر گئے اور اس کے حوالے سے ایسی تقریب کر گئے کہ اسے منفرد کہا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے جاپان کی شاعری کا عہد بعہد اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی تقریب پاکستان نیشنل سنٹر میں اس شان سے ہوئی کہ جاپان کے سفیر متعیّنہ پاکستان نے آ کر اس کی صدارت کی۔

اس شہر میں کتابوں کی افتتاحی تقریبیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ اور کس کس کتاب کی کیسی کیسی دھوم سے تقریب ہوئی ہے۔ مگر کیا ایسا بھی ہوا کہ کسی ملک کے سفیر نے آ کر اس کی صدارت کی۔

سچّی بات یہ ہے کہ شہر میں سب سے الگ اپنی دکان یا تو مولانا حالی نے کھولی تھی۔ یا اب عبدالعزیز خالد نے کھولی ہے۔ ذرا سوچو کہ ان جیسی شاعری کبھی کسی نے کی تھی یا اب کوئی کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ جب ترجمے کی طرف آئے تو اس کوچے میں بھی اُنہوں نے اپنی دکان سب سے الگ کھولی اور سب سے نایاب مال دکان پر رکھا۔ اب وشعر سے ترجموں کے رسیا انگریزی اور فرانسیسی سے واپس آئے تو یورپ کی دوسری زبانوں میں الجھ گئے جو بہت

واپس آئے وہ عربی ادب میں آ کر اٹک گئے۔ مگر عبدالعزیز خالد ان سب کو پیچھے چھوڑ کر جنوب مشرقی ایشیا پہنچے۔ اب سے پہلے انہوں نے ہوچی من کی نظموں کا ترجمہ کیا تھا۔ اب انہوں نے جاپان کی شاعری پہ ہاتھ ڈالا کہ نہ قدیم کو چھوڑا نہ جدید کو چھوڑا۔ ہر عہد سے نظمیں لیں اور ترجمہ کر ڈالیں۔

یار کہتے ہیں کہ عبدالعزیز خالد کمال آدمی ہیں۔ غیروں کی شاعری کے ترجمے کر رہے ہیں۔ اپنی شاعری کا ترجمہ نہیں کرتے۔ حالانکہ ضمیر جعفری ان سے کئی بار اپیل بھی کر چکے ہیں۔

بہرحال عبدالعزیز خالد کا دم اس شہر میں بہت غنیمت تھا۔ اور وہ تو بس اس شہر میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ مگر ملازمت کا چکر آدمی کو ایک جگہ ٹکنے کہاں دیتا ہے۔ یہ چکر انہیں کھینچ کر پھر کراچی لے گیا۔

تصویروں کی اس نمائش کا عبدالعزیز خالد نے بس باتوں باتوں میں افتتاح کر ڈالا۔

ہم بھاگتے دوڑتے نمائش گاہ میں پہنچے دیکھا کہ عبدالعزیز خالد جنہیں اس نمائش کا افتتاح کرنا تھا چائے پی رہے ہیں۔ اور باتیں کر رہے ہیں۔ ہم نے چپکے سے ایک دوست سے پوچھا کہ نمائش کا افتتاح کیا ہو چکا۔ اس نے کہا کہ آپ دیکھ نہیں رہے۔ افتتاح ہو رہا ہے۔ ہم نے پوچھا خالد صاحب افتتاحی تقریر کر چکے بولا جو باتیں کر رہے ہیں اسے ہی افتتاحی تقریر سمجھو ہم نے خالد صاحب کی باتوں پر کان لگائے۔ چہک رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ بس اس چہکنے بولنے میں نمائش کا افتتاح ہو گیا۔

کتنا خوب صورت افتتاح تھا۔ رسمیات سے بالکل بے نیاز۔ جہاں یہ نمائش آراستہ ہوئی تھی وہ بھی کوئی رسمی آرٹ گیلری نہیں تھی۔ یہ کوادر پر ایک شاپ تھی۔ کوادر والوں نے اپنے محبوب مصورہ نذیر کی خاطر اسے آرٹ گیلری بھی قرار دے دیا۔ کتابیں تو وہاں بارہوں مہینے بکتی رہتی ہیں۔ اس تقریب سے نذیر کی لینڈ سکیپ تصویریں بھی بک گئیں۔

چپڑی اور دو دو تصویروں کے ساتھ کتابوں کا بھی دیدار ہو گیا۔ ایک صاحب ذوق کو ہم نے دیکھا کہ کوادر پر آئیں داخل ہوا اور نہایت یکسوئی کے ساتھ کتابیں دیکھنے لگا۔ جب کتابوں کی ساری الماریوں کا جائزہ لے لیا تو واپس جانے لگا۔ ہم نے پوچھا نمائش نہیں دیکھو گے۔ بولا دیکھ تو لی۔ ہم نے کہا کہ ابھی تک تو تم کتابیں دیکھ رہے تھے۔ تصویروں

پر بھی ایک نظر ڈال لو۔ تعجب سے بولا۔ اچھا نمائش میں تصویریں بھی ہیں۔ ہم نے کہا کہ سیڑھیاں چڑھو پھر تمھیں تصویریں نظر آئیں گی۔

بہرحال آنے والے مہمانوں میں کسی نے کتابیں زیادہ یکسوئی سے دیکھیں۔ کسی نے تصویروں پر زیادہ توجہ صرف کی۔ کتابیں رنگ رنگ کی تھیں مگر تصویریں ایک ہی موقلم کا ہمز تھیں۔

اس مصور کو مناظر سے دلچسپی ہے۔ وہ شہر کی مخلوق نہیں ہے۔ گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہیں پلا بڑھا، کھیتوں جنگلوں، باغ باغیچوں میں آوارہ پھرا۔ بس وہ مناظر تصویر میں بس گئے۔ اور حافظہ پر نقش ہو گئے۔ برش اور رنگوں کے فن میں جب طاق ہوا تو ان مناظر نے یورش کی۔ اب مصور انھیں منظروں کو کینوس پر اتارتا ہے اور فن کے قدردانوں سے داد لیتا ہے۔

آپ کے پاس ہنر چاہیئے۔ قدردان بھی مل ہی جاتے ہیں۔ کواد پر اکوئی بہت کشادہ کتابوں کی دکان نہیں ہے۔ مگر دل میں جگہ ہونی چاہیئے۔ اس نے اپنی مختصر سی جگہ میں ایک گوشہ ان تصویروں کے لیے نکالا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ دیکھنے والے بیشک یک مشت تھے۔ لیکن پھر بھی کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ پھر بھی ایک رکھ رکھاؤ تھا کہ نسوانی کھوا صرف نسوانی کھوے سے اور مردانہ کھوا محض مردانہ کھوے سے چھل۔ ہاتھا جو تصویر دیکھنے کے لیے دم بھر کے لیے کھڑا ہو گیا۔ وہ گزرنے والوں کے لیے دیواریں بن گیا۔ مطلب یہ تھا کہ یہ تصویریں ٹک کر دیکھنے کے لیے نہیں ہیں۔ بس ایک طائرانہ نظر کے ساتھ دیکھتے جاؤ اور گزرتے جاؤ۔

غرض جس زاویے سے بھی ہم نے دیکھا۔ یہ نمائش ہمیں اپنی طرز کی الگ ہی نمائش نظر آئی۔ ایک مصنف کہہ رہا تھا کہ کیا مضائقہ ہے کہ اس چھوٹے سے گوشے میں میری کتاب کی افتتاحی تقریب بھی ہو جائے۔ پاکستان نیشنل سنٹر میں تو اس کاروبار دربار کے لیے گنجائش رہی نہیں۔

اب دلّی سے لاہور جایئے اور دیکھیئے کہ آج کے ایک لکھنے والے نے اپنے بزرگوں اور ہم عصروں کو کس طرح سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ وہاں علامہ راشد الخیری کو دیکھا۔ (مری زندگی فسانہ ـــــ صادق الخیری)

یہاں احمد ندیم قاسمی اور علامہ عبد العزیز خالد کو دیکھیئے۔ بیان کرنے والے ہیں عطاء الحق قاسمی۔

——— خاکہ نگاری اپنی جگہ ایک فن ہے۔ لازم نہیں کہ اچھا شاعر اچھا خاکہ نگار بھی ثابت ہو۔ مگر عطاء الحق قاسمی نے اس کتاب (عطائیے) میں ایک اچھے خاکہ نگار ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال شاید عبدالعزیز خالد کا خاکہ ہے۔

ہمارے یہاں شاعر بالعموم صرف اپنی شاعری سے غرض رکھتے ہیں۔ اپنے قاری سے بھی ان کا مطالبہ کبھی علانیہ کبھی ڈھکے چھپے یہی ہوتا ہے کہ وہ صرف اس کی شاعری سے غرض رکھے۔ ع

غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

ہاں ایک میراجی تھے جنہوں نے اپنے قاری سے یہ تقاضا کیا کہ میری شاعری تو خیر ہوئی مگر دنیا میں جو شاعری ہو چکی ہے اس سے بھی کچھ فیض اٹھاؤ۔ اس شخص کے یہاں اپنے لوگوں کو دنیا کی بڑی شعری روایت سے روشناس کرانے کی ایک بے پناہ خواہش تھی اس خواہش کے تحت میراجی نے مشرق اور مغرب کی شعری روایتوں سے بڑی شاعری سے شاہکار چنے انھیں اردو میں ترجمہ کیا شاعروں کا تعارف لکھا ان کا یہ کام مشرق و مغرب کے نغمے کے نام سے شائع ہوا۔

ان دنوں بھی بعض نئے شاعر مشرق اور مغرب کی نئی شاعری سے ترجمہ کی کارروائی میں تھوڑا بہت مصروف نظر آتے ہیں مگر میراجی کے بعد اس قسم کی بے پناہ اور بے لاگ تڑپ جس کے یہاں نظر آتی ہے وہ عبدالعزیز خالد ہیں۔ عبدالعزیز خالد کا جب اپنا ایک شعری مجموعہ شائع ہوتا ہے تو اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ان کے ترجموں کا کوئی مجموعہ سامنے آ جاتا ہے اور ہر مجموعہ کسی مختلف شعری روایت سے ہوتا ہے لگتا ہے کہ عبدالعزیز خالد نے پوری عالمی شعری روایت کو اپنی آماجگاہ بنا رکھا ہے۔

مگر اب کے جو کام عبدالعزیز خالد نے انجام دیا ہے وہ سب سے بڑھ کر ہے۔ اب تک تو شاعری کی ندیوں سے پانی کاٹ کر لاتے رہے ہیں۔ اس مرتبہ انھوں نے شاعری کے ایک بحرِ ذخار میں غوطہ زنی کی ہے اور وہاں سے موتی چن کر لائے ہیں شاعری کا یہ بحرِ ذخار قدیم ہند کا شاہکار مہابھارت ہے۔

مہابھارت کہانیوں تمثیلوں اور خطبوں کا ایک پورا سمندر ہے۔ اس کے اٹھارہ دفتر ہیں اور ہر دفتر ضخیم و دبیز۔ ایسے دفتر تو شاید دو تین ہی ہیں جن کی ضخامت ہزار سے کم صفحات کی ہے۔ یہ مت پوچھئے کہ ان سینکڑوں ہزاروں صفحات میں کیا ہے۔ یہ

پوچھئے کہ قدیم ہند کے فلسفۂ حکمت کا دل و دماغ کا وہ کونسا گوشہ ہے جو یہاں سمٹا ہوا نہیں ہے کورو پانڈو کی جنگ کی داستان تو ہے ہی اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے، یہاں کہانیوں، حکایتوں، تمثیلوں، دیوی دیوتاؤں کے قصوں کا ایک پورا سمندر ہے جو یہاں موجزن ہے۔ پھر خطبے وعظ، فلسفیانہ مباحث، قدیم ہندی تخیل نے جس طرح کائنات کی آفرینش اور نشو و نما کا تصور کیا اس کا بیان۔ جس طرح انسانی زندگی کی تعبیر کی اس کا تذکرہ۔

ایسے لمبے چوڑے دفتر کو پڑھنے کے لیے ایک عمر درکار ہے۔ کجا یہ کہ اس کا عطر نکال کر پیش کر دیا جائے۔ بہر حال عبد العزیز خالد نے یہ کام کر ڈالا ہے تین سو انسٹھ صفحوں کی اس کتاب میں جو مہابھارت کتھن مالا کے نام سے شائع ہوئی ہے مہابھارت کا عطر کھنچا نظر آتا ہے۔

عبد العزیز خالد ریڈیو اور ٹی وی کے زمانے میں پیدا ہونے باوجود محسن کاکوروی کی قسمت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ خالد صاحب آپ نے اتنی نعتیں لکھی ہیں مگر میں نے کبھی آپ کو ریڈیو اور ٹی وی کے کسی نعتیہ مشاعرے میں نہیں سنا۔

بولے "کبھی میں وہاں کے لیے یاد ہی نہیں کیا گیا۔" پھر کہنے لگے "میں نعت فرمائش پر نہیں لکھتا اپنے جذبے سے لکھتا ہوں۔"

ممکن ہے خالد صاحب کو اس سلسلہ میں ان اداروں سے دل میں کوئی شکایت ہو لیکن مجھے اس طور وہ خوش قسمت نظر آئے۔ اس طور وہ فرمائشی نعت گوئی سے بچ گئے۔

تو عبد العزیز خالد فرمائشی نعت گو نہیں ہیں۔ نہ کسی رسم کو پورا کرنے کے لیے نعت لکھتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت ان کے لیے محض اور خالی عقیدت نہیں رہی ہے، ایک تخلیقی تجربہ بن گئی ہے اور چونکہ انھیں کسی نعتیہ مشاعرے کے تقاضوں کو پورا کرنا نہیں ہوتا۔ ریڈیو اور ٹی وی کی پالیسی ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ اپنے اندر کے تقاضے کو زیادہ دیانت کے ساتھ پورا کرنے کی اور اپنے تجربے کو زیادہ سچائی کے ساتھ بیان کرنے کی حیثیت میں ہوتے ہیں۔

خالد صاحب کے نعتیہ کلام کا یہ تیسرا مجموعہ ہے اس سے پہلے "فارقلیط" اور "منحمنا" کے نام سے ان کے نعتیہ مجموعے

نکل چکے ہیں اور آپ ان ناموں سے اجنبیت پر نہ جائیں۔ واقعہ یوں ہے کہ عبدالعزیز اپنی باقی شاعری میں زبان و بیان کے اعتبار سے اجنبی نظر آتے ہیں مگر نعت میں آکر ان کے زبان و بیان میں سادگی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب وہ مفرّس و معرّب زبان و بیان کے دائرے سے نکل کر اس زبان و بیان کو اپناتے ہیں جس میں برصغیر کی آب و گل کی مہک شامل ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ "یہ محسن کاکوروی کا فیضِ صحبت تو نہیں"۔

بولے "نہیں اصل میں مجھے میرا بائی نے یہ راہ دکھائی ہے"۔

ان کے بیان سے مجھے ان کے یہ نعتیہ شعر یاد آئے:

میں شبدوں کی پیاسی ہیں چرنوں کی داسی
تری جستجو مجھ کو صبح و مسا ہے

بھڑکتی ہے دل میں برہ کی جوالا
تیرے بن یہ جیون سلگتی چتا ہے

یہ شعر ان کے پچھلے مجموعہ سے ہیں "ماذماز" کا رنگ کلام ملاحظہ فرمائیے:

حروفِ ناطق و زندہ کا حامل
مری منزل وہ میرا خضرِ منزل
وہ ازل اوّل معانی در معانی
وہ تا آخر فضائل در فضائل

اُردو زبان و بیان کو دیکھ کر ایک یہ احساس ہوتا ہے کہ اُردو قصیدے کی پوری روایت اس نعت کے پیچھے بول رہی ہے۔ عبدالعزیز خالد نے قصیدے کی روایت میں ڈوب کر اپنا لب و لہجہ نکالا ہے۔ اس لیے اس نعت کی جڑیں زیادہ گہری نظر آتی ہیں۔ قصیدے اور نعت کی قدیم روایت کے واسطے سے وہ ہمارے باطن کی گہرائیوں تک گئی ہیں۔ آج کل کے جو شاعر کسی نعتیہ مشاعرے میں شرکت کی خاطر نعت لکھتے ہیں۔ وہ نئی نظم کے اثر میں ہوتی ہے۔ اس کی جڑیں زیادہ گہری نہیں ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کے دل سے نکلی۔ اشرف صبوحی کے دل میں گھر کر گئی سید صاحب نے ادھر ادب اور اخلاقیات کے موضوع پر اپنا مقالہ ختم کیا۔ ادھر اشرف صبوحی نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اگلی شام ہمدرد خواتین کے لیے مخصوص ہو گی۔ بس شام ہمدرد میں جو حضرات تشریف لایا کرتے ہیں۔ وہ خود آنے کی زحمت نہ کریں۔ اپنی بیگمات کو بھیجیں۔

تو اب کی شام ہمدرد تاریخی ہمدرد تھی کہ اس کے ساتھ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ مردانہ شام ہمدرد اور زنانہ شام ہمدرد۔

اس شام ہمدرد کا موضوع تھا ادب اور اخلاقیات۔ اس موضوع پر ڈاکٹر وزیر آغا کو مقالہ پڑھنا تھا۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کو صدارت کرنی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب اپنا علمی مقالہ تمام کر چکے تو ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنا صدارتی مقالہ پیش کیا۔ بے شک یہ بھی علمی مقالے کی شان رکھتا تھا مگر اس میں محاکمے بہت تھے۔ اور سیدھے سیدھے قطعی بیانات، ایک بیان پہ تو ہماری سٹی گم ہو گئی۔ فرمایا کہ اردو تنقید پچھلے پچاس سال سے اس مہم پہ لگی ہوئی ہے کہ ادب اور اخلاقیات کے درمیان رشتہ منقطع کر دیا جائے۔

ہم حیران ہوئے کہ سید صاحب نے تو دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ ان پچاس برسوں میں کتنے نقاد گزرے ہیں اور کتنے تنقیدی دبستان ہوئے ہیں۔ کیسے کیسے مختلف ادبی نقطۂ نظر سامنے آئے ہیں۔ ترقی پسند تنقید بھی انھیں پچاس برسوں میں پھولی پھلی اور انھیں پچاس برسوں میں ایسے نقاد بھی گزرے ہیں جنھوں نے اسلامی فکر و شعور کو معیار بنا کر ادب کو جانچا پرکھا مثلاً محمد حسن عسکری، ان کے بعد والوں میں سلیم احمد جیلانی، کامران اور فتح محمد ملک بھی ہیں۔ اب اچانک شام ہمدرد میں جا کر ہم پہ کھلا کہ یہ سب ادب کی اخلاقیات سے طلاق دلانے پر تُلے ہوئے تھے۔

اس محفل میں عبد العزیز خالد بھی تھے وہ جلسہ کے بعد تک کڑھتے دیکھے گئے کہ یہ تو Over-simplification ہے۔ اخلاقیات کونسا تصور اخلاق جو بہت بحث طلب موضوع ہے اس پر دو ٹوک بیان نہیں دیا جا سکتا۔ مگر سید صاحب نے دو ٹوک بیانات دیئے تھے فرمایا کہ:

"بڑا ادب ہمیشہ اخلاقیات کے واسطے سے پیدا ہوتا ہے مثلاً ملٹن، شیخ سعدی، اقبال۔ عبد العزیز خالد کہتے تھے کہ ان کے علاوہ جو بڑے ادیب گزرے ہیں اور جن کے یہاں اس طرح سے اخلاقیات نظر نہیں آتی؟"

عبد العزیز خالد کی بات نے ہمیں سوچ میں ڈال دیا۔ ادب میں اخلاقیات کا مسئلہ خاصا اختلافی چلا آتا ہے یوں

بھی ہوا ہے کہ ایک ادبی کارنامہ کو ایک گروہ نے مخرّب اخلاق جانا۔ دوسرے گروہ نے اس میں سے کوئی بڑی اخلاقیات برآمد کر لی۔

یہ تو ایسا موضوع ہے کہ جتنا چاہو پھیلاتے چلے جاؤ۔ جتنا چھانو کرکرا۔ مثلاً یہ کہ یاروں نے ان دنوں غزلوں کو چھاننا شروع کیا تو غالب اور میر کی غزلیں بھی انہیں غیر اخلاقی نظر آنے لگیں۔ یعنی پچھلے پچاس سال کی تنقید جو کام نہیں کر سکتی تھی آج کے معلّم اخلاق کر ڈالنا چاہتے ہیں۔

ادب اور اخلاقیات پر جو کچھ کہا گیا اس پر عبدالعزیز خالد اگر جز بز تھے تو ڈاکٹر عبدالسلام خورشید محظوظ دکھائی پڑتے تھے۔

اے لو عبدالعزیز خالد صاحب تو پھر لاہور آ گئے۔ بس سمجھ لو کہ غالب کا مضمون اُلٹ گیا۔ اس نے مضمون یوں باندھا تھا کہ ؎

تیرا آنا نہ تھا ظالم مگر تقریب جانے کی

یہاں مضمون یہ ٹھہرا ہے کہ ع

ترا جانا نہ تھا ظالم مگر تقریب آنے کی

خالد صاحب کا لاہور سے جانا کل کی سی بات ہے۔ پچھلے برس جولائی میں گئے تھے تو حریف بدلہ بھر رہے تھے کہ کراچی جا کر جلدی کون آتا ہے۔ بسا اوقات آتا ہی نہیں۔ سو اگر خالد صاحب واپس آئے بھی تو رہ سنبھل کر ہی آئیں گے مگر وہ تو بس گئے اور آئے۔

پہلے تو ہم سمجھے کہ خالد صاحب نہیں آئے ہیں۔ بس ہمارا وہم ہے وہ آ گئے ہیں۔ مگر جب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ان کے اعزاز میں چائے کی تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑا کہ خالد صاحب آ گئے۔ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کچا کام کبھی نہیں کرتے۔ کام ہمیشہ پکا کرتے ہیں۔ اسی طرح جس طرح عبدالعزیز خالد شاعری پکی کرتے ہیں۔ چائے کے اہتمام میں بھی اُنہوں نے اپنی طرف سے پکا ہی کام کیا تھا کہ گنے چنے معززین ہی کو بلایا تھا مگر ایسوں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر پتھر جیسا بھاری۔ یعنی ایک محمد طفیل تو دوسرے مولانا نعیم صدیقی۔ اب یہ اپنا اپنا لہنا تھا کہ طفیل صاحب تو آ گئے مگر نعیم صدیقی تشریف نہیں لا سکے بلکہ فضل منّ اللہ صاحب بھی نہیں آئے۔ مگر خیر حفیظ احسن صاحب تشریف لے آئے تھے۔ بات یہ ہے کہ ویسے تو عبدالعزیز

خالد اپنی شاعری میں نیک چلن ہیں مگر کبھی کبھی ایسے کام بھی کر ڈالتے ہیں کہ ہوچی من کی نظموں کا ترجمہ کر ڈالا یا آپ روس کی شاعری سے ترجمے کرنے کی ان کے دماغ میں سمائی ہے۔

بہرحال عبدالعزیز خالد کے اعزاز میں اس چائے نے جس میں محمد طفیل اور قاسم محمود موجود تھے اور مولانا نعیم صدیقی اور فضل من اللہ موجود نہیں تھے۔ یہ ثابت کر دیا کہ عبدالعزیز خالد لاہور میں واقعی آ گئے ہیں۔

اصل میں خالد صاحب کراچی چلے تو گئے تھے مگر اس طرح گئے تھے کہ آدھا اِدھر آدھا اُدھر۔ وہ خود کراچی پہنچ گئے تھے مگر ان کا سارا کلام لاہور میں تھا۔ گھر کا باقی ساز و سامان تو کراچی لے جانا ممکن تھا مگر کلام کو لاہور سے کراچی لے جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

کراچی پہنچ کر پتہ چلا کہ عبدالعزیز خالد سے اگر ان کا کلام منہا کر دیا جائے تو وہ بہت ہلکے پھلکے آدمی ہیں چنانچہ یہ پورا عرصہ خالد صاحب نے اس شہر میں اس طرح گزارا کہ آج یہاں کل وہاں۔ کبھی ایک ہوٹل میں کبھی دوسرے ہوٹل میں۔ کبھی کسی دوست کے یہاں کبھی وائی۔ ایم سی اے میں۔ جب آدمی اتنا ہلکا پھلکا ہو تو اس کے لیے شہر سے نکلنا بھی کون سا مشکل ہوتا ہے چنانچہ کتنی آسانی سے خالد صاحب کراچی سے لاہور واپس آ گئے۔

لاہور آ کر خالد صاحب پھر بھاری ہو گئے ہیں۔ ان کا کلام جو ان کے ساتھ شامل ہو گیا ہے تو خالد صاحب کو ہلکا مت سمجھو۔ ان کی شاعری حریفوں اور رقیبوں پر بھاری پڑے گی۔ اصل میں ان کے کلام ہی نے انھیں لاہور کی طرف کھینچا ہے۔ وہ ہلکے تھے مگر کلام بھاری تھا۔ بس کھنچے چلے آئے۔ اب اس شہر میں پھر وہی ہم اور وہی عبدالعزیز خالد اور خالد صاحب سے جب ہم نے پوچھا کہ اب اس شہر میں آپ کی کیا صورت رہے گی تو یہی جواب دیا کہ ع

پھر وہی زندگی ہماری ہے۔

عبدالعزیز خالد محفل کی صدارت کر رہے تھے اور شعر سنا رہے تھے ؎

اس خود غرض زمانے میں ایسا بھی ہے کوئی
ٹوٹے ہوئے دلوں کی کرے جو رفوگری

طارق عزیز وہ تو میں عبدالعزیز ہوں
ہم ہیں کسی کو گو نہیں دعوے ہمسری

خالد ہے وہ عزیز عزیزِ جہاں اسے
دُوں میں دُعا ترقیِ کسبِ کمال کی

آپ پوچھیں گے کہ کیا عبدالعزیز خالد صاحب نے کسی کا قصیدہ لکھ ڈالا ہے۔ دیکھئے صاحب پہلی بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں قصیدے کی صنف سے کوئی شاعر انصاف کر سکتا ہے تو وہ عبدالعزیز خالد ہیں مگر یہ کہ وہ اپنے عہد کے شہنشاہوں کا قصیدہ لکھیں گے اس قسم کا کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔

اس محفل میں تو انھوں نے یہ دکھایا کہ قصیدے کی صنف صرف شاہوں کی طرح کے لیے کسی اور زمانے میں وقف ہو گی۔ مگر اس سے ٹوٹے ہوئے دلوں کی رفوگری کا بھی کام لیا جا سکتا ہے۔

ویسے اس محفل میں رفوگر اور بھی موجود تھے۔ اصل میں یہ محفل ایک نوجوان طارق عزیز کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی۔ ہمیں دعوت نامہ موصول ہوا کہ طارق عزیز کو محکمہ تعلیم میں ملازمت ملنے کی خوشی میں یہ تقریب ہو رہی ہے۔ تشریف لائیے۔ اس دعوت نامے نے ہمیں بہت پریشان کیا کہ یا اللہ اب ملازمت کی خوشی میں تقریبیں ہوا کریں گی اور ادیب اس پر خوشی کا اظہار کریں گے مگر پھر پتہ چلا کہ یہ معاملہ ہی اور قسم کا ہے۔ طارق عزیز تو اس بات کی مثال ہیں کہ ع

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

یہ نوجوان اپنی ٹانگوں سے رہ گیا۔ مگر ہمت نہیں ہارا۔ تعلیم حاصل کی۔ ایم۔ اے کیا۔ ساتھ میں کچھ اور ہنر بھی سیکھ لیے اور ان میں بہت مہارت پیدا کی مثلاً فوٹو گرافی کا فن۔

داد ان لوگوں کو بھی دینی چاہیئے۔ جنھوں نے اس نوجوان کی حوصلہ افزائی کی۔ اور جس مدد کا وہ مستحق تھا وہ مدد دی۔ اورنٹیل کالج کے مختلف اساتذہ اسی تقریب سے اس محفل میں شریک تھے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر وحید قریشی، سہیل احمد خان شہباز ملک اور چند دوسرے اساتذہ۔

تو گویا یہ محفل اس انسانی جوہر کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے منعقد ہوئی تھی۔ جو مشکل حالات میں اپنے لیے راہ پیدا کرتا ہے۔ ناکامیوں سے کام لیتا ہے۔ اور انسانی عزم کی مثال بن جاتا ہے۔

اس محفل کی صدارت خالد عبدالعزیز نے کی۔ انھوں نے صدارتی خطبہ منظوم پیش کیا۔ یوں کہہ لیجئے کہ قصیدے کی طرز کی نظم لکھ کر اس نوجوان کے عزم و حوصلہ کی داد دی۔

_____ امجد پرویز سٹیج پر آئے اور غالب کی غزلیں سنائیں ۔ اور آخر میں صدرِ محفل سے داد پائی ۔ صدرِ محفل عبد العزیز خالد نے داد دینے میں ایجاز اور اختصار کا کمال دکھایا اور کہا کہ ؏

مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

ان کی صدارتی تقریر اس ایک مصرع پر مشتمل تھی

جاڑا اپنی جگہ پہ رہزنِ تمکین و ہوش بنا ہوا تھا

اندر غالب موسیقی کی زد میں تھا باہر بارش کا سماں تھا

کہنے کو موسم بہار مگر اصل میں مہاوٹوں کے جاڑے کا دن ۔ یوں ہم نے یومِ غالب منایا ۔

رئیس امروہوی

عبدالعزیز خالد کے مجموعہ ہائے منظم (جن کا مکمل احاطہ کرنے کے لیے پانچ سو صفحے کی کتاب کی ضرورت ہے) اُردو کے خزینۂ شعر و ادب میں ممتاز و منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک اپنا اسٹائل اور مخصوص طرزِ فکر ہے۔ عبدالعزیز خالد اُردو، ہندی، فارسی، عربی اور انگریزی زبان کے ادب پاروں سے خوب واقف ہیں۔
ان کی تصانیف سے یہ رنگ جھلکتا ہے۔

——— اس مردِ عظیم سے ہم نے جو توقعات وابستہ تھیں۔ وہ یکے بعد دیگرے پوری ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

عبدالعزیز خالد فنِ سخن وری کے بحرِ ذخار ہیں۔ پُرگوئی اور ہمہ جہت شاعری کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ماذا عبدالعزیز خالد کی نعت گوئی کا نادر و نفیس مجموعہ ہے۔ اس کا اعتراف ہر شخص کو ہے۔ ثانیِ لاثانی میں شاعر نے صدیقِ اکبرؓ کی زندگی، سیرت اور اُسوہ کو حیران کن برجستگی اور شیوا نوائی کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔
بلاشبہ دونوں مجموعے اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہیں۔

عبدالعزیز خالد آبشارِ شعر اور جوئبارِ نظم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نجانے ان کے ذوقِ سخن نے کس کس پیرایۂ جمیل میں اپنا اظہار کیا ہے۔
عبدالعزیز خالد ایک ہمہ رنگ اور ہمہ آہنگ شاعر ہیں۔ انہوں نے لفظوں سے جس طرح معانی کے چمن زار کھلائے ہیں اور مختلف زبانوں کے الفاظ اور اسالیب کو کشید کر کے جس ہنرمندی کے ساتھ فکر و تخیل کا طلسم

عجائب قائم کیا ہے۔ اس کی مثال بلا شبہ نہیں مل سکتی۔ خالد ہر شخص و شاعر کے زاویے سے بھی بہت لکھا گیا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ گویا اقبالیات کی طرح خالدیات کا بھی ایک مستقل شعبۂ فکر و بیان وجود میں آگیا ہے۔ "تحریریں" لاہور کا ایک معیاری ماہنامہ ہے۔ اس نے عبدالعزیز خالد کی شاعری اور شخصیت پر تین ضخیم نمبر شائع کئے ہیں جن کی ضخامت ہزار ہزار صفحے سے زیادہ ہے۔ ان اشاعت ہائے خاص کی ترتیب میں ممتاز اہل قلم نے حصہ لیا ہے۔ عبدالعزیز خالد کی شاعری مطالب و معانی کے لحاظ سے ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ پھر بیان و اظہار میں ان کا مجتہدانہ طرز! —— ان کی شاعری ہر صنف اور ہر سمت میں راہنما کردار ادا کرتی ہے۔

بلا شبہ عبدالعزیز خالد نے اردو شعر کو رفعت بھی بخشی ہے۔ عمق بھی۔ وہ شمالاً جنوباً اور مشرق و مغرب میں پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اور اس طرح تخلیق کا ایک نیا افق اور آفاق وجود میں آگیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ ابھی ہم نے خالد کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق ہیں:

ع مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اسرار احمد سہاروی

———— اس دفعہ خالد صاحب کی نعت میں سادگی و پُرکاری کا رنگ بہت بھلا لگا۔ مختصر سا نعتیہ قصیدہ ہے۔ زمین ہموار ہے۔ بحر دلکش ہے۔ عبارت میں روانی اور آہنگ میں موسیقی کی دلآویزی ہے۔ غالباً قاآنی کے ایک مشہور قصیدے کا اتباع کیا ہے جس کا مطلع ہے۔

الایا خیمگی خیمہ فرو ہل
کہ پیش آہنگ بیروں شد زمنزل

عبارت کا زور اور روانی، ترکیب کی سادگی اور برجستگی، محبت اور احترام کا مجموعی تاثر ————

اس دفعہ عبدالعزیز خالد کی نعت نے شروع میں ہی پوری توجہ کو جذب کر لیا۔ میرے خیال میں یہ نعت ایک خوب صورت مرکب ہے غزل اور قصیدے کا اور ان دونوں ہی کی خوبیاں اس میں بدرجہ اتم موجود رہتی ہیں۔ ڈاکٹر احمد رفاعی صاحب نے ادیب اور شاعر کے بارے میں بالکل صحیح کہا ہے کہ

"وہ اپنے شعوری اور لاشعوری حسیات کے جزر و مد کو اپنے جذبہ و ذوق کی پراسرار خلوتوں میں سے گزارتا ہوا چابک دستی اور سلامت روی کے ساتھ ارسال و ابلاغ کی حقیقی منزل مراد تک پہنچا دیتا ہے۔"

خالد صاحب اس نظم میں اپنی حسیات جذبہ اور ذوق کو پوری چابک دستی کے ساتھ قاری تک ارسال کرنے میں

کامیاب ہیں۔ اس نظم میں ان کی سادہ بیانی خاص طور سے بہت پسند آئی ہے۔ وہ سادگی۔ پہلو داری اور ابہام آفرینی تینوں قسم کے ابلاغ پر پوری طرح قادر ہیں مگر ہم ان کی سادگی اور سلاست پر نثار۔ اس نعت میں سلاست کا ہی مظاہرہ نہیں بلکہ ترنم۔ روانی۔ زورِ بیان۔ تغزّل۔ والہیت اور سپردگی تمام خوبیوں کا بھرپور مظاہرہ موجود ہے۔ مخمّس کی ہیئت آفرینی نے عبارت میں تیز دریا کی سی روانی پیدا کر دی ہے اور قصیدے کی سی صورت گری کا کیف دامن کشی کر رہا ہے اور مخمّس میں حالی کے نعتیہ اشعار کو ٹیپ کا بند بنا کر نگینوں کی طرح جڑ دیا ہے۔

اقبال نے نعت میں ایک نیا آہنگ جو تمثیل یا بالواسطہ نعت نگاری کا پیدا کیا۔ اس کی پیروی حفیظ جالندھری اور عبدالعزیز خالد نے بھرپور طریقے سے کی ہے۔ اور ان دونوں نے اس طرز کو ایک مستقل فن کا درجہ دے دیا ہے۔ بقول سید عبداللہ کے کہ:

"اس سے پہلے نعت میں چند مخصوص عنوانات کے تحت لکھا جاتا تھا، مثلاً سلام، درود صلوٰۃ۔ تحیات، خاکِ حجاز سے محبت، مدینہ پہنچنے کا شوق۔ دیارِ حبیب میں مر جانے کا شوق۔ کبھی سراپائے رسول کا وصف۔ کبھی خلقِ عظیم کی تعریف۔ انسانیت پر آپ کے احسانات۔ قومی مصائب میں امداد کی درخواست۔ کبھی شفاعت کی درخواست وغیرہ وغیرہ۔"

علامہ مرحوم، حفیظ اور خالد صاحب نے نعت کے دامن میں بڑی وسعت پیدا کر دی۔ نعت کی وسعت کو اظہارِ عقیدت اور جذباتِ محبت سے تاریخی واقعات اور تمثیل مدح تک پھیلا دیا۔ اس طرح اس فن میں لامحدود امکانات پیدا ہو گئے۔ حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام سراپا مدحِ رسول ہے۔ ہر واقعہ کی کڑی بالواسطہ یا بلاواسطہ مدحِ رسول سے مل جاتی ہے۔ اور اس لیے شاہنامہ اسلام کو اُردو اَدب میں جو شہرت حاصل ہوئی ہے۔ وہ کم کتابوں کو حاصل ہو سکی ہے۔ آج کل عبدالعزیز خالد اس فن میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ خالد صاحب نے تاریخی نعت میں ایک اور اضافہ کر دیا ہے

کہ اساطیری عناصر کو بھی نعت میں شامل کر لیا ہے۔ اور ہندی اور یونانی دیو مالا کو اکثر اپنی نعتیہ نظموں میں آزادانہ استعمال کیا ہے مگر بعض ناقدین کے نزدیک یہ اسلام اور نعت نبی کے مزاج سے کچھ زیادہ مناسبت پیدا بھی کر سکے۔ کیونکہ اساطیری تصورِ عظمت۔ روحانیت اور اسلام کی روح میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس خلیج کو پاٹنا کسی شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے اس معاملے میں زیادہ مبالغہ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا کرشن جی کا تصور ہندو دیو مالا میں پایا جاتا ہے یا رام چندر جی کی سیرت جو ہندو دیو مالا نے پیش کی ہے۔ وہ بہت بڑی حد تک خیالی بلکہ نمونۂ اوہام پرستی ہے۔ حقائق پر مرورِ ایام نے بہت گہرے پردے ڈال دیئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ ایک حقیقی اور تاریخی سیرت سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ان دونوں میں کوئی قدر مشترک باقی نہیں رہ جاتی۔ مثلاً اگر خالد صاحب کرشن جی اور ان کی گوپیوں کا ذکر کریں تو ان میں اور صحابیاتِ رسول کی زندگی میں آپ کیا قدرِ مشترک تلاش کریں گے؟ تشبیہہ اور تمثیل میں ایک وقیع اور گہری قدر مشترک کا وجود لازمی ہے وجہ شبہہ نہ ہو۔ تو پھر تشبیہ کس کام کی۔ البتہ محسن کاکوروی نے ہندو ادب اور لہجے اور آہنگ کو زیادہ احتیاط کے ساتھ استعمال کیا ہے اور ایسی تشبیہات اور استعارات کو استعمال نہیں کیا جو سیرتِ نبوی سے بڑی حد تک مطابقت نہ رکھتی ہوں وہ بلاشبہ عظمت اور رومانیت۔ دونوں کا تصور پیدا کرنے میں بہت کامیاب ہیں۔ محسن کاکوروی کے نمونے صبح تجلّی اور مشہور قصیدہ مدیح خیر المرسلین میرے اس دعوے کی اچھی دلیل بن سکتے ہیں۔ محسن کاکوروی کو خود بھی اپنے "سراپائے رسول" پر بڑا ناز تھا۔ اور اس سلسلے میں ان کا ذات باری سے ایک مکالمہ میں مشہور ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہے یہ اُمید کہ جب گرم ہو بازار نشور
یوں کہے بادشہ بارگہِ عالم نور
لو سراپا ہیں دو تم عوض حور و قصور
میں کہوں واہ مجھے یہ نہیں ہرگز منظور
مفت حاضر ہے مگر اس کی یہ تدبیر نہیں
کھوٹے داموں بکے یوسف کی یہ تصویر نہیں

محسن اور خالد کا موازنہ یہاں منظور نہیں کیونکہ بات طویل ہو جائے گی۔

عقیدتمندی کے اظہار میں عفت موہانی توحد سے گزر گئی ہیں اُنھوں نے تو کسی دوسرے کہنے والے کے لیے گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ خالد صاحب کو الوہیت کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ اب آگے کوئی کیا کہے۔ تبریک عید میں فرماتی ہیں ؎

ثنا تیری مری معراجِ فن ہے
تو ہی تو میرا موضوعِ سخن ہے

نثار اس عفتِ فانی کی عمرِ رائیگاں تجھ پر

جب عمرِ فانی کسی پر نثار ہو گئی تو رائیگاں کہاں رہی۔ وہ تو بڑی کام کی ثابت ہوئی، یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا مگر آگے چل کر اُنھوں نے خالد صاحب کو مسجود اور معبود کا درجہ عطا فرما دیا۔ اگر اسے شاعرانہ تعلّی بھی خیال کیا جائے تب بھی ایک مسلمان کے لیے کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا نہ معبود بننے کا اور نہ معبود کہلوانے کا۔ عفت صاحبہ فرماتی ہیں

"منصور انا الحق کہتے تھے۔ میں دل ہی دل میں انا الخالد کا ورد کرتی ہوں اپنے پاک و منزہ (؟؟) محسوسات میں آپ کو میں نے سچ مچ معبود و مسجود کا درجہ دے رکھا ہے۔ اب تو حال یہ ہے کہ کوئی شاعر، کوئی ادیب، کوئی مفکر جچتا ہی نہیں۔ سب مجھے ایسے بالشتیے لگتے ہیں کہ ان کی اہمیت صفر کے برابر بھی میرے دل میں نہیں رہ گئی اور آج کل کے ٹٹ پونجیے جاہل شاعروں کی تو ایک سطر بھی نہیں پڑھتی۔ . . ."

آگے چل کر محترمہ نے فارسی اور اُردو کے تمام شعراء کا صفایا کر دیا ہے۔ فرماتی ہیں:

"لکھنؤ میں ایک ادبی نشست میں بڑی گرما گرمی ہوئی؛ آپ کو کونسا شاعر پسند ہے؟ میں نے فوراً کہہ دیا کہ شاعر اگر واقعی کوئی ہے جسے تلمیذ الرحمٰن کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف خالد ہے اس کے سوا ماضی، حال اور مستقبل کا کوئی شاعر نہیں۔ سب واہی تباہی ہیں حتیٰ کہ رومی، حافظ، عرفی، غالب، اقبال، حالی سب بیکار۔"

دیکھا آپ نے جوشِ عقیدت میں مستقبل کے امکانات کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس دعوائے غیب دانی کی بھی داد دینی پڑے گی۔ بہر حال خالد صاحب کو اس والہانہ سپردگی کی داد دینی پڑے گی۔ سپردگی عورت کی فطرت بھی ہے اور جوہر بھی۔ خالد صاحب کے فن کی عظمت بہر حال مسلّم ہو جاتی ہے۔

غالباً ارسطو نے شاعری کی غایت ذوقِ جمال کو قرار دیا۔ افلاطون پہلے ہی اس کی طرف اشارات کر چکا تھا۔ لونجائنس نے باقاعدہ اس سمت کو آگے بڑھایا اور اپنے موقف کو بڑی حد تک تسلیم کرا لیا۔ برگساں اور فرائیڈ نے اس کا نام Elan vital اور Libido رکھ لیا اور بڑی حد تک اس اصول کی تائید کر دی۔ فرائیڈ نے یہ اصول وضع کیا کہ بعض اوقات اخلاقی، اعتقادی اور معاشرتی مجبوریوں کی وجہ سے ذوقِ جمال کو تحت الشعور میں دھکیل دیا جاتا ہے اور وہ موقع بہ موقع بالائی شعور پر حملے کرتا رہتا ہے۔ مجھے خالد صاحب کا معاملہ بھی اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کیتھارسس یا ذوقِ جمال بہت طاقت ور ہے اور اُنہوں نے بعض مجبوریوں کے تحت اس کو اندر دھکیل دیا ہے اور جب اُسے کوئی تحریک مل جاتی ہے تو وہ باہر آنے کے لیے سخت منہ زوری کرتا ہے اور بڑی حد تک نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت خالد صاحب کی ان نظموں میں زیادہ واضح ہے جو اُنہوں نے ہندی دیومالا کے حوالے سے کہی ہیں خواہ وہ گیت کی صورت میں ہوں یا نعت کے طور پر، غزل کی حیثیت میں ہوں یا عنوانی نظم کی فارم میں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی لائقِ توجہ ہے وہ یہ کہ خالد صاحب کے الفاظ کا ذخیرہ بھی بے پناہ ہے۔ اس ذخیرہ میں اُنہوں نے اُردو، فارسی، عربی، سنسکرت، عبرانی وغیرہ بہت سی زبانوں کے الفاظ و تراکیب جمع کی ہیں۔ اس لیے جب کیتھارسس کا زور ہوتا ہے تو یہ الفاظ بھی ذہن میں نازل ہونا شروع کر دیتے ہیں۔ اور خالد صاحب بلا امتیاز نزول کی ترتیب سے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اتفاق سے طبیعت کی موزونیت بھی زبردست ہے۔

اسی لیے اپنے مخصوص طرز میں سینکڑوں اشعار موزوں کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اسی لیے ان کے اکثر اشعار عام قاری کے لیے چیستان بن جاتے ہیں، کیونکہ کسی قاری کا ذخیرۂ الفاظ اتنا زبردست نہیں ہوتا کہ ان اشعار کو بلا تکلف سمجھ سکے اس طرح خالد صاحب کا سہلِ ممتنع سخت مجروح ہو جاتا ہے۔

زاہدہ صدیقی

مُعجز بیان

اے میرے مُعجز بیان شاعر!
تو فکر اور فن کی جس بلندی پہ جلوہ فرما ہے
اس کی نسبت سے لکھنا چاہُوں تو لفظ ایسے کہاں سے لاؤں
جو اس کی بلندی کو بھی سمیٹیں اور اس کے پہلو بہ پہلو
مری عقیدتوں کو بھی لفظ و معنی کا رُوپ بخشیں
اے میرے مُعجز بیان شاعر!
تو فکر و فن کا کھلا سمندر ہے جس میں اقبال کے تصوّر کی لہر بھی ہے
تو میر و سوداؔ کی نکتہ سنجی کی موج بھی ہے
اس میں حافظ اور سعدی کا فلسفہ ٹھاٹھیں مارتا ہے
تو رُومی کے اور بلال کے سچّے جذبے کا مدّ و جزر بھی ہے
اے میرے مُعجز بیان شاعر!
بلاشبہ تو عظیم شاعر ہے

اس سے انکار کی کسے تاب ہو سکے گی
مگر مرے واسطے کٹھن مرحلہ یہی ہے
کہ فیصلہ ہو کہ شاعری میں عظیم ہے تُو
یا شخصیت میں عظیم تر ہے۔
کہ دونوں ہی پہلوؤں سے تیرا مقام اُونچے پہاڑ سے بھی بلند و بالا ہے
میرے معجز بیان شاعر!

عطاء الحق قاسمی

میں تحسین فراقی کو اُس وقت سے جانتا ہوں۔ جب یہ عبدالعزیز خالد کا مداح ہوا کرتا تھا۔ بلکہ تحسین فراقی بھی مجھے اس وقت سے جانتا ہے۔ جب میں بھی عبدالعزیز خالد کا مداح ہوا کرتا تھا۔ آج اس واقعے کو قریباً پانچ برس گزر چکے ہیں۔ اور اس عرصے میں پُلوں کے نیچے سے کتنا ہی پانی بہہ چکا ہے۔ یعنی عبدالعزیز خالد شاعری کی منزلیں طے کرتے کرتے کہیں کے کہیں پہنچ چکے ہیں۔ اور اب عبدالعزیز خالد کے سلسلے میں ہم دونوں کی مدّاحی، مدّاحی کی حدود سے نکل کر عقیدت کی حدود میں داخل ہو گئی ہے کہ ان کا ذکر ہمیں ان کے ہم عصروں کے ساتھ نہیں اب اقبال کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔

ایک عید کارڈ پر تو ہم نے عبدالعزیز خالد کے اشعار بھی لکھے دیکھے۔ یہ بات ہم اندازے سے کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ شعر عربی میں تھے۔

ضمیر جعفری صاحب ایک روز عبدالعزیز خالد کے مہمان ہوئے۔ اور وہاں کچھ لکھنے کے لیے اُنھوں نے خالد صاحب سے ان کا قلم مستعار لیا۔ مگر تین چار دفعہ کی کوشش کے باوجود قلم ان سے نہ چل سکا۔ اس پر اُنھوں نے خالد صاحب کو قلم واپس کرتے ہوئے کہا یہ آپ رکھ لیجیے۔ اسے غالباً آسان اُردو لکھنے کی مشق نہیں ہے۔

اسلامیہ کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے بیدار ملک گزشتہ دنوں میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے: "ہم ایک شام منا رہے ہیں"۔ اس سے قبل اُنھوں نے جو دو کامیاب شامیں منائی تھیں۔ وہ میرے علم میں تھیں۔ ان میں سے ایک شام عبدالعزیز خالد کے ساتھ تھی اور دوسری شام بھی عبدالعزیز خالد کے ساتھ تھی۔ چنانچہ جب اُنھوں نے کہا کہ وہ ایک شام اور منا رہے ہیں۔ تو میں نے ان کے لیے اپنا ہیٹ اُتار دیا۔

گزشتہ ہفتے پشاور اور راولپنڈی کے بارہ دانشور ایک قافلے کی صورت میں لاہور پہنچے۔ اور تسخیر قلوب کے بعد واپس اپنے اپنے شہروں کو روانہ ہو گئے۔ یہ دوست شوکت واسطی کی سرکردگی میں آئے تھے۔ اور انھی کے ساتھ لوٹے۔ اس قافلے میں صادق تسنیم بیگم صادق تسنیم، محسن احسان، بیگم ثروت محسن احسان، میجر یوسف رجا، جناب کوثر خان، قدسیہ قدسؔ اور انیسہ شیخ بھی شامل تھے ——— ان کے اعزاز میں بہت خوب صورت محفلیں بھی سجیں۔ مثلاً ان میں سے ایک محفل کا اہتمام تو ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ہی نے اپنے گھر پر کیا تھا جو پچھلے دنوں خود پشاور میں بہت سی دعوتیں اڑا کر آئے تھے۔ یہاں عبدالعزیز خالد نے قدسیہ قدسی اور انیسہ شیخ سے غزلوں کی فرمائش کی۔ اور وہ صرف یہ کہ ان سے پورے اصرار کے ساتھ دو دو تین تین غزلیں سنیں۔ بلکہ انہیں بے تحاشا داد بھی دی۔ مجال ہے اُنھوں نے سوکھے منہ سے ہی کسی شاعر سے بھی غزل کی فرمائش کی ہو۔

پشتو کے ممتاز شاعر اور دانشور پریشان خٹک چند روز قبل مرکزی اُردو بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کے لیے لاہور آئے۔

تو سائرہ ہاشمی نے ان کے اعزاز میں اپنے گھر پر ایک دعوت دی۔ اس دوران مغرب کی اذان ہوئی تو پریشان خٹک نماز کے لیے اٹھے عبدالعزیز خالد بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ قریباً تین چار منٹ بعد یہ دونوں ادیب لوٹے۔ تو شرکاء محفل میں سے ایک نے پریشان خٹک کو مخاطب کر کے کہا: "خان صاحب! آپ اتنی جلدی نماز سے فارغ ہو گئے؟" اس پر پریشان خٹک نے مسکرا کر جواب دیا: "میں تو مسافر ہوں۔ میں نے تو صرف فرض ادا کرنے تھے۔ آپ یہ سوال تو عبدالعزیز خالد صاحب سے پوچھیے!"

کچھ روٹوں پر یہ سروس بہت کامیاب ہے۔ مگر کچھ روٹوں پر اوور لوڈنگ کی وجہ سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ بس کے اندر عربی، فارسی، عبرانی، سنسکرت، سریانی اور لاطینی وغیرہ کے مقولے کثیر تعداد میں درج نظر آتے ہیں۔ تاہم کہیں کہیں تبرکاً اردو کے جملوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ شروع شروع میں اس بس میں سفر کے دوران مسافروں کو بہت ہچکولے لگتے تھے۔ لیکن اب کچھ تو وہ عادی ہو گئے ہیں۔ اور کچھ بس بھی پہلے سے سنبھل گئی ہے۔ ڈرائیور کی زبان گفتگو کے دوران ذرا غوطہ کھا جاتی ہے۔ باقی وہ فسٹ کلاس آدمی ہے۔

(عبدالعزیز خالد بس سروس)

تحسین فراقی

عبدالعزیز خالد ہمارے ان جدید نعت گو شعراء میں سے ہیں جنہیں نعت گو نہیں بلکہ قصیدہ گو کہا جائے تو یہ زیادہ مناسب معلوم ہو۔ چنانچہ خالد کی نعتیہ کاوشوں میں نہ صرف یہ کہ اردو نعت کی پوری روایت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ بلکہ انھوں نے عربی اور فارسی نعت کی محکم روایتوں کو بھی اپنی نعت میں جذب کیا ہے۔ اور یوں ایک ایسا اسلوب نکالا ہے۔ جو سراسر ان کا اپنا ہے۔ وہ اب تک ہمیں نعتوں کے پانچ مجموعے دے چکے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا تعقیبہ مجموعہ "ماذ ماذ" ان کے ماسبق کے مجموعوں سے بازی لے گیا ہے۔ ان معنوں میں کہ اس مجموعے میں بہ نسبت سابقہ مجموعوں کے لفظوں اور مرکبات کی غرابت کم ہے اور اس میں شامل اکثر نعتیں رواں۔ سادہ۔ صاف اور فصاحت و بلاغت کا نادر نمونہ ہیں۔ سبکِ عرب تو یہاں بھی ہے اور کہیں کہیں سنگلاخ آفرینی بھی۔ لیکن بہت کم۔

تاہم یہاں بھی سابق عبدالعزیز خالد نے احادیث و روایات۔ تلمیحات اور کتب سیر سے حسب دلخواہ استفادہ کیا ہے۔ "ماذ ماذ" میں محبت کے متنوع جذبات، اظہار کے مختلف اسالیب اور مدح و منقبت کے رنگا رنگ پہلو نظر آتے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کا ہر بچے مسلمان کی طرح عقیدہ ہے کہ حضور کا پیغام کسی مخصوص عہدہ، فرد، قدم، نسل، تاریخ یا جغرافیے تک محدود نہیں۔ بلکہ ہر عہد کے انسان کے لیے ہے اور یہ کہ ہر دور ان سے فیضیاب ہوتا رہے گا۔

ظلمت کدۂ دہر میں لو دیتی رہے گی
تا صبح ابد شمعِ فروزانِ محمد

کائنات کی ہر شے اس انسانِ کامل کے فیض کی مرہونِ منت ہے۔ جو اُخوت، عدل اور فکر کا امام تھا۔ چنانچہ خالد کہتے ہیں۔ اور کتنے سادہ و پرکار انداز میں کہتے ہیں

کرے ہر رُودِ عصر اس کو سلام
لے کے آیا جو عدل کا پیغام
وہ نقیبِ اُخوتِ انسان
جس نے کی دولتِ محبت عام!

دیویوں کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ جس کسی کو عزیز رکھتی ہیں۔ اسے کہیں کا نہیں رکھتیں۔ یہ بات اور دیویوں پر صادق آتی ہو یا نہیں۔ مگر شعر کی دیوی پر ضرور فِٹ بیٹھتی ہے۔ چنانچہ عبدالعزیز خالد کو بھی اس دیوی نے ماسوا سے بیگانہ کر کے فنافی الشعر کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ اگر شعر کی کوئی توحید ہوتی ہے تو عبدالعزیز خالد اس دور کے سب سے بڑے موحد شاعر ہیں۔ موصوف کچھ وقت قبل نیشنل سینٹر میں ماہانہ تذکارِ سیرت کے زیرِ اہتمام مجلس سیرت میں نعت پڑھ رہے تھے۔ جو فن اور خلوص کا نادر نمونہ تھی اور کیفیت یہ تھی کہ

بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

میں ان دنوں بیکار تھا۔ (۱۹۷۲ء) اور وقت گزاری کے لیے میں نے عبدالعزیز خالد جیسے غامض اور ادق شاعر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کر دیا تھا۔

خالد — مَلِکُ الکلام

بربطِ عصر ہے، شہرودِ نوا ہے خالد — سازِ ایام کا آہنگِ بقا ہے خالد
داورِ فکر ہے، لفظوں کا خدا ہے خالد — جانِ فن، جانِ سخن، جانِ غنا ہے خالد
حسنِ صورت بھی یہاں، حسنِ معانی بھی یہاں — حسنِ اظہارِ خیالات و اغانی بھی یہاں
طرزِ بہزاد بھی، پیرایۂ مانی بھی یہاں — حافظ و صائب و خیام و قاآنی بھی یہاں
امرؤ القیس کی آزاد بیانی بھی یہاں — ابی سُلمیٰ کے قصیدے کی روانی بھی یہاں
تلسیِ ہند کے اقوالِ شہانی بھی یہاں — عکسِ اقبال بھی ہے، طرزِ فغانی بھی یہاں
طرزِ محسن بھی ہے، حسان کا اسلوب بھی ہے — فکرِ سحبان و سنائی اسے مرغوب بھی ہے

کونسا نغمۂ سرمد نہیں بیدار یہاں؟
بس کہاں، تبصرۂ خالدِ پُرکار کہاں!

"سخنتا" بھی ایک طویل نعتیہ قصیدہ ہے۔ یہ قصیدہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں حضور اکرم صلی

اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت، ان کے سراپا اور ان کی تعلیمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور اس کے لیے خالد نے جو اسلوب بنایا ہے وہ سراسر خالد کا اپنا ہے۔

"ماذا" عبدالعزیز خالد کا ایسا نعتیہ مجموعہ ہے۔ جو ان کے سابقہ مجموعوں اور بعد کے مجموعے سے بازی لے گیا ہے۔ اس میں بھی نعتیہ شہر آشوب موجود ہیں۔ خالد اس میں ایک جگہ ہوا کو اپنا پیغامبر بنا کر اسے سوئے طیبہ بھیجتے ہیں۔ اور پھر نوعِ انسانی اور ملت بیضا کے دکھوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ لے "باعثِ بہجتِ دنیا، رُخِ زیبا تیرا" نامی نعت میں اور گھمبیر ہو گئی ہے۔

——— خالد کے ان نعتیہ شہر آشوبوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے ان آشوبوں میں بعض فکری سوالوں کا اضافہ کر کے ان کو ایک نئی جہت عطا کر دی ہے۔ اسی طرح "خروشِ خم" کے سے بے مثال ملی و ثنائی نظموں پر مشتمل مجموعے میں ان کا ایک شاہکار نعتیہ شہر آشوب "یا رحمۃ للعالمین" دامن دل کھینچتا ہے۔ اور ملتِ اسلامیہ اور پاکستان سے ان کی بے پناہ محبت اور اس کی نظری اساس سے ان کے اٹوٹ انسلاک کی گواہی دیتا ہے۔

انٹرویو (نوائے وقت لاہور

عطاء الحق قاسمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلامی ادب کی نمائندہ شخصیت کون سی ہے؟

مشفق خواجہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلامی ادب تو کچھ معیارات رکھتا ہے۔ اور جو ان پر پورا اترتا ہے۔ وہ اسلامی ادب میں شمار ہو گا۔ مثلاً عبدالعزیز خالد۔

تحسین فراقی۔ ابھی جو آپ نے عبدالعزیز خالد کی مثال دی۔ ان کے ہاں اسلامی ادب کے رجحانات تو ہیں۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی ادب میں فحاشی آسکتی ہے یا نہیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان کی نگارشات کا نصف حصہ ایسا ہے جسے فحش کہا جا سکتا ہے۔ باقاعدہ اس کی بہت سی مثالیں:

عطاء الحق قاسمی: اسلامی ادب میں دھرتی پوجا آسکتی ہے۔ تو فحاشی بھی آسکتی ہے۔ ایسی کون سی بات ہے؟

مشفق خواجہ: فحاشی کا مسئلہ ایسا ہے کہ علامہ اقبال جیسے اسلامی شاعر کی شاعری میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
خطا اس میں سرکار بندے کی کیا تھی (اصل: تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی)

اب آپ کہیں کہ خودی کی تعلیم دینے والا ایسے شعر بھی کہتا ہے

عطاء الحق قاسمی: خواجہ صاحب وہ تو ایک ابتدائی دور تھا۔ وہ اس سے گزر گئے۔

تحسین فراقی: لیکن عبدالعزیز خالد تو پچاس سے بھی اوپر ہیں۔ ان کا دورہ کب آئے گا؟

مشفق خواجہ: آپ کی تنقید پڑھتے ہی راہ راست پر آجائیں گے۔